انشائیہ شناسی

تنقیدی و تحقیقی مضامین

محمد اسد اللہ

انشائیہ شناسی

محمد اسد اللہ

نام کتاب : انشائیہ شناسی
مرتب : محمد اسد اللہ
موضوع : تنقید
مطبع : سلمان فائن آرٹس، مومن پورہ، ناگپور/ ۴۴۰۰۱۸
کمپوزرس : محمد رفیع الدین/توصیف احمد
کمپیوٹر کمپوزنگ : ساحل کمپیوٹرس، حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور/ ۴۴۰۰۱۸
سرورق : توصیف احمد
سالِ اشاعت : ۲۰۱۹ء
ضخامت : ۲۴۰/ صفحات
تعداد اشاعت : ۵۰۰
قیمت : ۱۳۳/ روپئے (ایک سو تینتیس روپئے)

ملنے کا پتہ/رابطہ : ☆ محمد اسد اللہ، ۳۰/ گلستان کالونی، جعفر نگر، ناگپور/ ۴۴۰۰۱۳
موبائل نمبر :+91 957 959 1149
☆ صالحہ بک ڈپو، نزد جامع مسجد، محمد علی روڈ، مومن پور،ہ ناگپور ۴۴۰۰۱۸
☆ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، پرنسس بلڈنگ، ای آر روڈ، ممبئی/ ۳ (مہاراشٹر)
☆ دفتر ماہنامہ الفاظ ہند، ڈاکٹر شیخ بنگر کالونی، کامٹی/ ۴۴۱۰۰۱

یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔ نیز شائع شدہ مواد سے اردو کونسل کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

INSHAIYA SHANASI

BY MUHMAMMD ASADULLAH
E mail : zarnigar2006@yahoo.com

مشمولات

انتساب

مشہور مزاح نگار اور انشائیہ نگار

احمد جمال پاشا

کے نام

... محمد اسد اللہ

عرض مرتب

انشائیہ میری تخلیقی وتحقیقی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ اس سلسلے میں میری کتابیں : بوڑھے کے رول میں، ڈبل رول (انشائیے)، انشائیہ کی روایت مشرق ومغرب کے تناظر میں (تحقیق)، یہ ہے انشائیہ (تنقیدی مضامین اور تراجم کا مجموعہ) شائع ہو چکی ہیں۔

'انشائیہ شناسی' میں ایسے مضامین شامل ہیں جن میں اس صنف کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا گیا ہے۔ اردو کے معروف قلمکاروں کے خیالات مذاکرے میں موجود ہیں۔ انشائیہ اردو ادب میں ایک ایسی صنف ہے جو مغرب سے درآمد شدہ ہے اور اس کی فنی نزاکتوں نے اس کے متعلق مباحث کے دروازے کھول دیے۔ کسی بھی صنف کو اس کی تعریف یا تنقیدی مباحث کے ذریعے سمجھنے کے بجائے اس کے تخلیقی فن پاروں کا مطالعہ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ تاہم اس قسم کی تحریریں اس صنف کے لوازمات کو سمجھانے میں کسی حد تک معاون ہو سکتی ہیں۔

امید ہے کہ انشائیہ شناسی کی میری اس کاوش کو ادبی حلقوں میں سراہا جائے گا۔

اس کتاب کی اشاعت میں جن احباب نے تعاون سے نوازا، میں ان تمام کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اسی طرح قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کا بھی مشکور ہوں جس کے مالی تعاون سے یہ کتاب منظر عام پر آئی۔

ناگپور

مورخہ ۱۳؍فروری ۲۰۱۹ء محمد اسد اللہ

محمد اسد اللہ کے انشائیے

...بن تیرے ادب کے گھر بے چراغ ہیں...

اردو ادب میں انشائیہ کا مقام اور مرتبہ ہمیشہ مشکوک رہا ہے، جنس سے صنف تک۔ اس ستم ظریف کی طرح جس نے ایک کلب میں ایک لڑکی کو دیکھ کر ساتھ بیٹھے ممبر سے کہا تھا: ''دیکھئے اس لڑکی نے کیسا لباس پہن رکھا ہے!'

تو ممبر نے جواباً کہا: ''وہ لڑکی نہیں لڑکا ہے اور میرا بیٹا ہے۔''

پوچھنے والے نے معذرت چاہ لی اور بولا: ''ساری، مجھے اس بات کا علم نہ تھا کہ آپ اس لڑکے کے باپ ہیں۔''

''باپ نہیں میں اس کی ماں ہوں۔''

ذرا دھیرے بول کوئی سن لے گا:

انشائیے کے بادشاہ محمد اسد اللہ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی حادثہ ہوا جب ایک فوجی افسر نے ریٹائرمنٹ کے بعد اخبار کا دھندا شروع کیا تھا اور اس اخبار کے ادبی صفحے کا نگراں بھی تھا، محمد اسد اللہ سے پوچھا کہ یہ انشائیہ کیا ہوتی ہے؟ جواب ملا: ''خان صاحب یہ ہوتی نہیں ہوتا ہے۔''

لیکن عالی جاہ! وہاں تو آپ نے دامن بچالیا۔ لیکن اس کا کیا کیجئے گا۔ جب کوئی ایم اے (اردو) کا طالب علم آپ سے پوچھے گا: ''کیا آپ وہی محمد اسد اللہ ہیں جنھوں نے یہ شعر کہا تھا: مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمھیں۔

ایسی حالت میں آپ کے پاس ایک ہی Escape Route ہے جس سے آپ کا دامن تو بچ سکتا ہے لیکن پگڑی نہیں۔ انشائیہ ہر ایک کے بس کا نہیں،

بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی

محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے

ہیں

یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا

تو آئیے تھوڑی سی بحث کریں۔ انشائیہ اعظم کسے کہیں۔ محمد اسد اللہ نے اپنی کتاب 'یہ ہے انشائیہ' (۲۰۱۷ء) میں ۱۰۵/انشائیہ نگاروں کی لسٹ مہیا کی ہے۔ وزیر آغا سے لے کر رام لعل نابھوی سے ہوتے ہوئے زوبی جعفری تک ۳۹ مجموعے آچکے ہیں، جن میں محمد اسد اللہ کے مجموعے، 'بوڑھے کے رول میں'' (۱۹۹۱ء) اور 'ڈبل رول' (۲۰۱۵ء)، وزیر آغا کا مجموعہ 'چوری سے یاری تک' (۱۹۶۶ء)، 'آم کے آم'، رام لعل نابھوی، پروین طارق کے 'بولتے سناٹے' (۲۰۱۵ء) پیش پیش ہیں۔ علاوہ ازیں انشائیہ سے متعلق ۲۳ مطبوعات کی لسٹ بھی دی ہے جس میں ڈاکٹر سلیم اختر کی 'انشائیہ کی بنیاد' (۱۹۸۶ء) اور 'اردو انشائیہ کے ابتدائی نقوش' (لطیف ساحل) اور محمد اسد اللہ کی کتاب بعنوان 'انشائیہ کی روایت، مشرق و مغرب کے تناظر میں' اہم ہیں۔ جہاں تک تنقید کا تعلق ہے اردو میں انشائیے پر ڈاکٹر انور سدید کی کتاب 'انشائیہ اردو ادب میں' (۱۹۸۵ء) کو حرفِ آخر تسلیم کیا جاچکا ہے جس میں انشائیے کے تیور، اس کے خد وخال، اس کے ناز اور نخرے، اس کے داؤ پیچ کھل کر بیان کیے گئے ہیں۔ انشائیہ پر بحث اس کتاب کے مطالعے کے بغیر ادھوری ہے۔ ورنہ انشائیہ وہیں کا وہیں کھڑا رہ اجائے گا

جہاں چالیس سال پہلے تھا۔

میرے خیال میں یہ طے کرنے کے لیے کہ انشائیہ کیا ہے، بہتر یہی ہوگا کہ یہ فیصلہ ہو جائے کہ انشائیہ کیا نہیں ہے۔ پیدل تو سبھی چل رہے ہوتے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ کم گہرا کون ہے؟ پہلی شرط یہ ہے کہ انشائیہ طنز و مزاح سے کوسوں دور ہے۔ انیس ناگی کا فرمان ہے کہ اگر ہنسی مذاق، پھبتی اور جگت سے انشائیہ جنم لیتا ہے تو پھر نقال، بہت بڑے انشائیہ پرداز ہیں۔ اور تہواروں پر جواب الجواب اور تمسخر، انشائیوں کے مجموعے ہیں۔ موٹی بات یہ ہے کہ انشائیہ کو طنز و مزاح کے دائرے میں لانا اپنے آپ میں طنز و مزاح ہے۔

انشائیہ نہ کوئی معمہ ہے نہ معجزہ، انشائیہ میں کوئی جملہ دوبارہ نہیں کہا یا لکھا جاتا۔ کوئی بات ایک بار کہہ دی تو کہہ دی اور نہیں کہی وہ کہی ہوئی بات سے زیادہ معنی خیز ہے۔ بقول وزیر آغا سر گودھوی، 'معمولی شے کے غیر معمولی پن کو سطح پر لانے کا نام انشائیہ ہے۔' کھلی ہوا میں ایک پرندہ پروں سے اڑنا بھول گیا۔ انشائیہ میں قہقہہ لگانے کی اجازت نہیں ہے اسے ہنسنے کے لیے اپنا PAN نمبر اور رونے کے لیے آدھار کارڈ رکھنا پڑے گا۔ جب وہی رونا چاہتا ہے تو اس کے پاس ٹائم نہیں اور ہنسنے کے لیے ٹائم پیس نہیں ۔ انشائیہ میں کھل کر بات نہیں ہوتی، بس آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ ہو جاتا ہے۔ صرف مسکراہٹ کی گنجائش ہے وہ بھی زیرِ لب۔ اس میں اصل چیز موضوع نہیں ہے۔ انشائیہ سچائی کا ڈھنڈھورا نہیں پیٹتا بلکہ جھوٹ کو قابلِ برداشت بنا دیتا ہے۔ اس میں بات بنتی نہیں بنائی جاتی ہے۔ مضمون کی طوالت کے پیشِ نظر یہی کہوں گا اس کی وضاحت تک پہنچنے کے لیے محمد اسد اللہ کے منتخب انشائیے بہ عنوان ''دوسرا الکٹ'' مرتبہ ڈاکٹر اظہر ابرار (۲۰۰۹ء) ضرور پڑھئے۔ کرشن چندر کا 'الٹا درخت' اور منٹو کے 'سیاہ حاشئے' بھی انشائیے کی زد سے نہیں بچ سکے۔ قصہ کوتاہ دریا کو کوزے میں بند کرتے ہوئے حافظ کرناٹکی نے صحیح لکھا ہے کہ 'لوگوں کے بکھرتے خواب، اجڑے دل اور ادھورے ارمانوں کی ادبی کاوش کا نام انشائیہ ہے یعنی بے معنی باتوں میں معنی کی تلاش۔' (دوسرا الکٹ)

امید اور انتظار انشائیے کے دو بنیادی عنصر ہیں۔ یونانی فاتح سکندر اعظم جس نے پنجاب کے صرف ۲۲ گاؤں پر قبضہ کیا تھا تاریخ میں اسے سکندر کہتے ہیں۔ اور جو دولت، سونا، چاندی، ہیرے جواہرات کی شکل میں اس کے ہاتھ لگا اس نے سب کے سب اپنی فوج میں بانٹ دئے۔ توسیلوکس (سکندر کا سپہ سالار) نے پوچھا: حضور! آپ نے اپنے لیے کیا رکھا ہے؟ تو سکندر کا جواب تھا: امید اور انتظار۔ اور جب میرے ہم وطن پوچھیں گے کہ ہندوستان سے کیا لائے ہو، تو میرا جواب وہی ہوگا 'امید اور انتظار'۔ لیکن دیوتاؤں کو یہ منظور نہیں تھا۔ کیونکہ اس نے دیوتاؤ کی آگ چرائی تھی۔ اور جو رہی سو بے خبری رہی۔ لہٰذا کوئی یونانی شاعر اس واقعے پر انشائیہ نہ لکھ سکا۔

انشائیہ ناعاشقانہ حقیقتوں کی عاشقانہ تشریح ہے جن میں نظیر صدیقی کے الفاظ میں حکمت سے لے کر حماقت تک ساری منزلیں طے ہو جاتی ہیں سوائے ایک منزل کے یعنی منزلِ مقصود۔

پیاسوں کے مقدر میں نہ آیا کوئی قطرہ
کہتا رہا دریا کہ نیا سال مبارک

انگریزی میں انشائیہ کا نام Essay ہے۔ یہ فرانسیسی کا لفظ ہے اور عربی سے لیا گیا ہے۔ اس کے معنی میں 'ادبی کاوش' اس کے لغوی معنی ہیں۔ ایک مختصر نثری اور ادبی تحریر بلا امتیاز مضمون یا موزوں یا مقصد۔ نہ کوئی معمہ ہے نہ معجزہ۔

انگریزی لغت کے بانی Dr. Samuel Johnson نے اسے A loose saly of mind کہا یعنی ذہن کی آزاد ترنگ کچھ ناقدین نے اسے ذہن کی آوارہ خیالی سے منسوب کیا۔ اردو میں پہلا انشائیہ ۱۹۵۸ کے قریب لکھا گیا لیکن فرانس میں انشائیے کے بانی مانتین Montaign نے اسے ۱۵۷۱ء میں منظر عام پر لایا۔ ہندوستان میں اسے انگریزی کے اخبارات مختلف ناموں سے چھاپتے رہے ہیں ۔ جیسے ٹریبون میں اس کا نام تھا، Of my head ہندوستان ٹائمز میں Middle،

انڈین ایکسپریس میں Time out سٹیٹسمین میں Now Again۔ مانتین نے اپنے انشائیوں کو 'ہم وجود' کا نام دیا۔

انگلستان میں ایڈیسن اور اسٹیل کے انشائیے کافی مقبول ہوئے۔ جیسے ہندوستان میں انڈین ایکسپریس اور سٹیٹسمین کے۔ یہ دو اخبار ایسے تھے جن کے انشائیوں پر بھی بحث ہوتی تھی۔ اسٹیٹسمین کے قاری تو آج بھی سب سے پہلے ایڈیٹوریل کو کھولتے ہیں اور انشائیہ پڑھنے کے بعد فرنٹ صفحے کی ہیڈ لائنس دیکھتے ہیں۔ میرا انشائیہ جب بھی اس اخبار میں چھپتا ہے میرا فون نان اسٹاپ بجتا ہے اور بیوی نان اسٹاپ ریڈیو لگا دیتی ہے۔ محمد اسد اللہ کے انشائیوں میں ساز بھی ہے اور سوز بھی۔ بقول انور سدید 'انشائیہ اندھیرے کے جگنو کی طرح ہے جو منزل کی امید تو دلاتا ہے لیکن خود منزل نہیں بنتا۔ انشائیہ میں عصری آگہی معروضی نہیں بلکہ انشائیہ عصری آگہی کو بھی ایک نئی لو کے تاثر میں تبدیل کر دیتا ہے'۔ لہٰذا آج انشائیہ عصری حقیقت بن چکا ہے جیسا 'بوڑھے کے رول میں'، دوسرا الکٹ، گنگنانا۔ محمد اسد اللہ لکھتے ہیں کہ 'گنگنانا اور نہانا دونوں کا پیدائشی وطن ایک ہی ہے، حمام خانہ۔ گانا ایک سماجی عمل ہے اور گنگنانا ایک انفرادی فعل'۔

میں زندگی کے ساتھ بہت دور تک گیا
یہ اور بات ہے کہ تعارف نہ ہو سکا

بہرکیف انشائیہ ایک دریائے عشق ہے اور ہر عاشق کو ڈوب کے جانا ہے۔ اپنا مضمون ایک قصے پر ختم کرتا ہوں۔

جب آدی شنکر آچاریہ منڈن مشرا سے ایک اہم ویدک بحث کرنے بہار کے شہر گیا میں پہنچے تو ایک پھول بیچنے والی مالن سے منڈن مشرا کے گھر کا رستہ پوچھا۔ مالن بولی : جوگی سیدھے چلے جاؤ، گلی کے نکڑ پر جس صحن میں طوطے وید پاٹھ کر رہے ہوں وہی منڈن مشرا کا گھر ہے۔ حسبِ شرطِ بحث شنکر آچاریہ کو سرسوتی کو ایک سو ایک پیلے گلاب کے پھول چڑھانے تھے۔ بحث کی امپائر Umpire یعنی منڈن مشرا کی بیوی نے جب پھول گنے تو ایک پھول کم تھا۔ شنکراچاریہ اسی پھول کی تلاش میں نکل پڑا۔ تلاش آج تک جاری ہے۔

میرے خیال میں محمد اسد اللہ بھی گم شدہ پھول کی جستجو میں محو ہے۔ دیکھئے کیا ہو۔

OOOO

محمد اسد اللہ

اردو انشائیہ: ایک مذاکرہ

اس مذاکرے میں اردو کے چند معروف قلم کاروں کو ان موضوعات کے حوالے سے دعوتِ فکر دی گئی جن سے اردو انشائیے کا دامن بار ہا الجھتا رہا ہے۔ آج بھی انشائیے کے لیبل تلے ایسی تحریریں عام طور پر شائع ہو رہی ہیں جن میں محض حسنِ بیان اور اظہار کا عمومی رنگ دیکھ کر قارئین اس فریب میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ یہ انشائیہ ہے۔ انشائیے کو سمجھنے، برتنے اور اس سے لطف اندوز ہونے والے شائقینِ ادب اب بھی چاہتے ہیں کہ یہ گرہیں کھلیں جس سے انشائیے کی شناخت کا مسئلہ حل ہو۔ یہ مذاکرہ اسی سلسلے کی ایک کوشش ہے۔

انشائیے کو نثری ادب کی ایک صنف کے بجائے محض ایک طرزِ اظہار قرار دے کر معدودے چند ادیبوں نے نہ صرف انشائیے میں موجود تخلیقی امکانات کو محدود کر دیا بلکہ مغربی انشائیے کے تصور سے بھی اسے جدا کر دیا تھا۔ انشائیے کا یہی حشر مشکور حسین یاد

کے اس بیان سے بھی ہوا جس میں انشائیے کو امُّ الاصناف کہا گیا ہے۔

اس مذاکرے میں بھارت کے مشہور نقاد سلیم شہزاد نے انشائیے کو نثری ادب کی ایک صنف اور ثقافتی مظہر تسلیم کرتے ہوئے دیگر اصناف کے ساتھ اس کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ معروف محقق ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے جدید انشائیہ کی شناخت اور اس کے فروغ میں ڈاکٹر وزیر آغا کی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔

اردو کی قدیم تصنیف 'سب رس' کو انشائیے کا اولین نقش قرار دے کر ایک گمراہ کن خیال پیش کیا گیا تھا جس سے یہ مغالطہ پیدا ہوا کہ یہ صنف مغرب سے مستعار نہیں بلکہ ہمارے ادب سے ابھری ہے۔ دوم یہاں بھی انشائیے کے ساتھ تمثیل، خیال آرائی اور آرائشِ زبان کا تصور جڑ گیا۔ ڈاکٹر یحییٰ نشیط نے پر اس سلسلے میں زور دلائل کے ساتھ یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ سب رس فارسی تصنیف کا ترجمہ ہے جس میں ربط و تسلسل کی کمی ہے، پند و نصائح سے بوجھل یہ تحریر انشائیہ جیسے لطیف ادبی اظہار کا نقش کیسے ہو سکتی ہے؟ انھوں نے سر سید کے مضمون 'امید کی خوشی' کو اردو انشائیہ نگاری کا اولین نمونہ تسلیم کیا ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ تحقیق کے بعد اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ 'امید کی خوشی' کو سر سید نے انگریزی کے ایک مضمون سے اپنے انداز میں ترجمہ کیا تھا۔ انشائیے کو محض ایک اسلوبِ بیان ماننے اور دیگر فن پاروں میں پائی جانے والی عبارت آرائی کو انشائیہ قرار دینے سے، ایک نقصان یہ ہوا کہ انشائیے اور ان اصناف کے مختلف ہونے کا تصور دھرا کا دھرا رہ گیا۔

سلام بن رزاق نے افسانے اور انشائیے کے درمیان فرق کو بیان کر کے دونوں کے خد و خال واضح کیے ہیں۔ ڈاکٹر صفدر نے انشائیے میں تخلیقی امکانات کا جائزہ لیتے ہوئے ان عوامل کی طرف اشارہ کیا ہے جو انشائیے کے فروغ میں رکاوٹ کا سبب ہیں۔ جب تک انشائیے کو طنزیہ و مزاحیہ مضمون کے فریم سے باہر نکال کر ایک فن پارے کے طور پر قبول نہیں کیا جائے گا جس میں فنکار ایک تخلیقی جست کے ذریعے معنویت کے نئے دائروں کو جنم دیتا ہے، ہم انشائیے کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔ مزاح نگار شکیل اعجاز نے انشائیے کی داخلی ہیئت اور اس کے اظہار کی نوعیت کو خوبصورت مثالوں کے ذریعے بیان کیا ہے۔ انشائیے کی مختلف تعریفوں کو نقل کر کے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انشائیہ بہر حال اپنے قاری سے ایک تربیت یافتہ ادبی ذوق اور ذہنی افتاد کا مطالبہ کرتا ہے۔ (م۔ا۔ا)

سلیم شہزاد:

سوال: انشائیہ طنز و مزاح کی طرح محض ایک طرزِ تحریر ہے یا ادب کی ایک علاحدہ صنف ہے؟

جواب: اگر سوال کے پہلے جز کا جواب نفی میں دیا جائے تو پھر سوال پیدا ہوگا کہ انشائیہ آخر کیا ہے؟

اس سوال کی حد تک انشائیے کی اگر کوئی شناخت یا اس کا کوئی شناختی نام نہیں ہے تو اسے یہاں ادب کی ایک علاحدہ صنف کیوں کہا جا رہا ہے؟ اس سوال در سوال کی کیفیت کو حل کرنے کے لیے (۱) انشائیہ، (۲) طنز و مزاح، (۳) صنف کی اصطلاحی شعریاتی افہام و تفہیم ضروری ہے۔

ہمارے صحیح غلط انشائیہ نگار اور بھلے برے ناقدین طنز و مزاح کو انشائیے سے بے سبب جوڑتے ہیں۔ طنز و مزاح بیانیہ نثر و نظم کا ایک اسلوب/طرزِ تحریر ضرور ہے لیکن انشائیہ (وہ جو کچھ بھی ہے) غیر تخیلی بیانیہ ہرگز نہیں ہے۔ یہ افسانوی بیانیے کی طرح تخلیقی چیز ہے اس لیے طنز و مزاح کا (وہ چاہے افسانے ہی کا اسلوب ہو جائے) انشائیے سے تعلق نہیں آئے گا۔ جن نام نہاد انشائیوں میں ناقدین طنز و مزاح کے عوامل موجود بتاتے ہیں، وہ طنزیہ و مزاحیہ مضامین تو ہو سکتے ہیں، انشائیے نہیں ہو سکتے۔ اب اس سوال کی تیسری اصطلاح صنف کو لیجیے۔

ادب ایک لسانی مظہر ہے جس کی دو اہم ہئیتیں نظم اور نثر پائی جاتی ہیں۔ہمارا مسئلہ چونکہ انشائیہ ہے اور یہ نثر میں لکھا جاتا ہے اس لیے ادب میں انشائیے کی شناخت کے تعین کے لیے ہمیں نثر کے لسانی ، ساختی ہئیتی ، موضوعی اور صنفی عوامل کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے جو انشائیے کو بطور صنف قائم کرتے ہیں یا اس کے برعکس بھی کہ ان عوامل کی موجودگی کے باوجود انشائیہ اپنی صنفی حیثیت قائم نہیں کر پاتا۔انشائیہ ہماری زبان اور ہمارے عہد میں چونکہ نثر کی ہیئت میں تشکیل ر تخلیق پاتا ہے اس لیے انشائیے کی اپنی شناخت کے تعین کے لیے اسے دوسری نثری اصناف کے ساتھ رکھ کر دیکھنا چاہیئے کہ یہ ان سے کتنی مشابہت رکھتا ہے یا نہیں رکھتا۔عام نثری ادبی اصناف ہیں : مضمون ، کہانی ، سفر نامہ ، روداد ، ڈراما وغیرہ۔واضح رہے کہ طنز و مزاح مذکورہ تمام اصناف کا اسلوب ہو سکتا ہے جبکہ انشائیہ طنز و مزاح کے اسلوب کو نہیں اپناتا اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انشائیہ ان اصناف میں کسی سے تھوڑی سی بھی مشابہت رکھتا ہے؟

کہانی کی مختلف ہئیتیں جو ان کی طوالت سے پہچانی جاتی ہیں۔انشائیے کی ہیئت بھی طوالت ہی سے پہچانی جاتی ہے ،مگر یہ کہانی کی طرح زیادہ سے زیادہ طوالت کے بجائے کم سے کم طوالت کو اپنی انفرادیت بناتا ہے۔تخیلی رتخلیقی ہونا بھی کہانی اور انشائیے دونوں کا مشترک وصف ہے لیکن ماجرا ، منظر ، ماحول ، کردار ، طنز و مزاح وغیرہ اضافی عوامل سے انشائیہ کوئی تعلق نہیں رکھتا ۔اسی طرح انشائیہ کہانی (افسانے ناول وغیرہ) سے الگ شناخت ضرور بناتا ہے ۔انھی خطوط پر دوسری نثری بیانیہ اصناف سے بھی انشائیے کا تقابل ممکن ہے ۔لسانی سطح پر اس کا بیانیہ ، موضوع کی اہمیت ، اسلوب کی شگفتگی اور صنفی انفرادیت کا حامل ہوتا ہے اس لحاظ سے نثری بیانیہ اصناف میں انشائیے کی ادبی حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

زیرِ بحث موضوع کی پہلی اصطلاح یعنی انشائیہ جیسا کہ ہم نے دیکھا نثری بیانیہ اصناف میں ایک انفرادیت یا انفرادی شناخت کی حامل ہے۔یہ شناخت اسے بعض صنفی نوعیاتی خصوصیات کی وجہ سے حاصل ہے اور وہ یہ کہ شعر و ادب کی ہر صنف کی طرح انشائیہ بھی ایک ثقافتی مظہر ہے۔جو لسانی اثر آفرینیوں اور معاشرتی عصری ضرورتوں اور شعریاتی تقاضوں کے زیرِ اثر نشوونما پاتا ہے۔اردو شعری اصناف کی تاریخ اس وقوعے کی شہادت دیتی ہے۔ہر ادبی صنف اپنے عصری اور لسانی تقاضوں کے پس منظر سے ظہور کرتی اور اپنی شناخت بناتی اور ایک عرصہ باقی رہ کر یا دوسری صنف میں مبدل ہو جاتی ہے (مثال کے لیے قصیدے کو یاد کیجیے) انشائیہ بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں برگ و بار لایا۔چند اہم لکھنے والے اسے میسر بھی آئے مگر نصف بیسویں صدی کے حالات نے سیاست کے ساتھ ادب میں بھی اتھل پتھل مچا دی۔مضمون ، افسانہ ، روداد اور سفر نامے وغیرہ اصناف نے اس دور میں اہمیت حاصل کر لی اور نتیجے میں انشائیہ بیانیہ اصناف کے پس منظر کا حصہ بن کر رہ گیا۔اقبال اور اکبر کے طنزیہ اور مزاحیہ اسالیب نے ’’اودھ پنچ‘‘ کے مصنفین کی صف سامنے لا کھڑی کی جس کی وجہ سے سرسید ، مولوی عبدالحق ، حسن نظامی ، فلک پیما وغیرہ کی انشائیہ تحریریں قہقہہ زا ماحول میں گم ہو گئیں اور سمجھا جانے لگا کہ انشائیے ہنسنے ہنسانے والی تحریریں ہوتی ہیں۔

سوال : کیا اردو میں انشائیہ کی ترقی کے امکانات روشن ہیں؟

جواب : عصری ثقافتی ، معاشرتی ماحول ، ادبی فلسفہ پسندی ، زبانوں پر مشینی ترجموں اور تکنیکوں کے اثرات اردو تعلیمی تربیت کی دھندلاتی فضا ، سیاسی جبر و تسلط وغیرہ عوامل کی موجودگی نے لسانی شعریاتی افہام و تفہیم کی ناگزیریت کو ختم کر دیا ہے۔ایسے ماحول میں انشائیہ کی ترقی کے روشن امکانات پر اظہارِ خیال کرنا

عصری ماحول سے روگردانی کرنے کے مترادف ہے۔

ڈاکٹر شرف الدین ساحل:

سوال :اکثر قارئین و ناقدین کے ہاں انشائیے کا تصور بہت واضح نہیں ہے، ہر قسم کی تحریروں کو اس میں شامل کرنے کی روش عام ہے، اس کا کیا سبب ہے؟ انشائیہ آخر ہے کیا؟

جواب :انشائیہ مغربی صنفِ ادب ہے جس کی تشریح و تفہیم ابتدا ہی سے اختلاف کا شکار رہی ہے۔ اگرچہ انگریزی میں اس کو Essay کے نام سے موسوم کیا گیا لیکن فرانسیسی ادیب مان ٹین اور انگریزی ادیب بیکن سے لے کر دورِ حاضر تک اس لفظ کے معنی الجھے ہوئے رہے ہیں َناقدین اس سلسلے میں ہنوز کسی یقین کی منزل تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ اردو ادب کے ناقدین بھی اسی کشمکش میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مضمون، مقالہ، اور طنز و مزاح ان سب کو انشائیے کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ ان اصناف کا انشائیے سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں ہے۔ اردو کے بعض مضمون نگار، مقالہ نگار، اور طنز و مزاح نگار اسی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ وہ اپنی اس قسم کی تحریر کو انشائیہ ہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ انشائیہ نہ تو صرف سنجیدگی کا تقاضا کرتا ہے اور نہ ہی طنز و مزاح کا۔ یہ سپاٹ اور سیدھے راستے سے ہو کر نہیں گزرتا بلکہ عنوان کے دائرے میں رہ کر عالمِ مستی میں کسی بھی جانب اپنا رخ کر لیتا ہے۔ وہ حالتِ دیوانگی میں بحر و بر، خشک و تر، صحرا و بیاباں، گلشن و ویراں سب کی سیر کرتا ہے لیکن اپنے بنیادی خیال سے انحراف نہیں کرتا۔ گویا انشائیہ ذہن کی ایک ایسی مفکرانہ رو ہے جو سب کو سمیٹتے ہوئے چلتا ہے۔ لیکن اپنے محور سے نہیں ہٹتا اور نہ ہی شگفتگی و ادبیت کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑتا ہے۔ یہ ہنساتا بھی ہے اور رلاتا بھی۔ سنجیدہ بھی کرتا ہے اور مغموم بھی۔ ان سب کے علاوہ طنز بھی کرتا ہے اور غور فکر دعوت بھی دیتا ہے۔ جس تخلیق میں یہ خوبیاں مضمر ہوں گی وہی انشائیہ کہلائے گا۔

سوال :انشائیہ نگاری کے فروغ میں ڈاکٹر وزیر آغا کی کوششوں کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

جواب :اردو انشائیے کی تاریخ میں کئی نام نظر آتے ہیں لیکن ڈاکٹر وزیر آغا وہ پہلے انشائیہ نگار ہیں جنھوں نے اس فن کی تفہیم و تشریح کر کے پورے فنی اور ادبی رکھ رکھاؤ کے ساتھ انشائیے تحریر کیے ہیں۔ ان کے انشائیے حقیقت کے شاہد ہیں۔ انھیں زبان و اظہارِ بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ ان کے انشائیے جامعیت اور شگفتگی سے آراستہ ہیں۔ انھوں نے اردو ادب میں اس صنف کو عام کرنے کے لیے باقاعدہ مشن چلایا، دوسروں کو اس کی ترغیب دی اپنے رسالے، ماہنامہ اوراق، لاہور میں نئے انشائیہ نگاروں کا دل کھول کر استقبال کیا۔ یوں یہ بے مثال صنف اردو ادب میں عام ہوئی۔

ڈاکٹر یحییٰ نشیط:

سوال :بعض ادیبوں اور ناقدین نے سب رس کو انشائیہ کا اولین نقش قرار دیا ہے ۔آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب :اس سوال کا جواب دینے سے قبل 'سب رس' کی ادبی خصوصیات کا جان لینا ضروری ہے۔

۱۔ 'سب رس' وجہی کی کوئی مستقل تصنیف نہیں، یہ فتاّحی کی فارسی تصنیف 'دستورِ عشاّق' کا ترجمہ ہے۔

۲۔ وجہی نے سن ۱۶۳۵ میں یہ ترجمہ کیا تھا۔ اس زمانے میں دکنی زبان مغربی ادب سے نا آشنا تھی۔ سب رس خالص مشرقی ادب کا نمونہ ہے۔

۳۔ سب رس کی نثر مقفیٰ اور مسجع ہے۔

۴۔ سب رس کے اصل قصے میں ربط و تسلسل کی کمی ہے۔

۵۔ یہ قصہ تمثیلی ہے اور اعضائے جسمانی کو کردار بنایا گیا ہے۔ وجہی کے بیان کردہ قصے کے اکثر واقعات انسانی نفسیات سے لگّا نہیں کھاتے۔

۶۔ اس میں تو ہماتی اور اسطوری فکر کی فراوانی ہے جو زندگی سے جڑے روزمرہ کے حقائق کی نقیض ہے۔

۷۔ وجہی نے اپنی اس تصنیف میں نثری اسلوب میں شاعرانہ لب و لہجہ اختیار کیا ہے۔

۸۔ داستانی طرزِ بیان اپنایا گیا ہے۔

۹۔ وجہی نے اس میں واعظانہ لب و لہجے کو ترجیح دی ہے۔ وجہی کے نصائح و مواعظ تحریر کو بوجھل بنا دیتے ہیں۔

مذکورہ بالا تمام خصوصیات سے انشائیے کا کوئی تعلق نہیں۔ صرف ایک آدھ پیرا گراف اگر انشائیہ کی لفظیات اور اس کے تحریر سے اتفاقاً مربوط ہو جانے سے ہم سب رس کو انشائیہ کا اولین نقش نہیں کہہ سکتے۔ بے ساختگی اور روانی انشائیہ کی جان ہے وہ سب رس میں مفقود ہے۔ ذہنی تناؤ سے نکال کر قاری کو فرحت و انبساط سے ہم کنار کروانا جو انشائیہ کا خاص وصف ہے، سب رس میں وہ بات نہیں۔

سب رس میں موہوم دنیا کے تخیلاتی حوال پیش کیے گئے ہیں۔ انشائیے میں موہوم دنیا کا کوئی گزر نہیں۔ مذکورہ بالا تمام شواہد سب رس کو انشائیہ کا اولین نقش ہونے کی نفی کرتے ہیں۔

۱۰۔ اگر سب رس کو انشائیے کا اولین نقش قرار دیا جاتا ہے تو ناقدین کی اس رائے کو مسترد کرنا پڑے گا جس میں وہ انشائیہ کو مغربی صنف سے تعبیر کرتے ہیں۔

دراصل سر سید اور بھارتیندو ہرش چندر کے زمانے میں ہندی اور اردو میں انشائیے کی ابتدا ہوئی۔ دونوں نے 'خوشی' کے عنوان پر مضامین لکھے تھے۔ سر سید کی تحریر ''امید کی خوشی''، اردو میں انشائیے کا اولین نمونہ تھی تو بھارتیندو کا نبندھ 'خوشی اس' کا ابتدائی نمونہ قرار پایا۔

سوال :انشائیہ مضامین کی دیگر اقسام سے کس طرح مختلف ہے؟ اس کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں؟

جواب : کسی خاص موضوع پر لکھی گئی وہ تحریر جو ایک نشست میں بارہ پندرہ منٹ میں پڑھی جا سکے، مضمون کہلاتی ہے۔ مضمون چار پانچ صفحات تک، مختصر اور سات آٹھ صفحات تک طویل ہو سکتا ہے۔ مضمون کے موضوعات ادبی، صحافتی، ثقافتی، تاریخی، علمی، سائنسی، سماجی، سیاسی اور تخیلاتی ہو سکتے ہیں۔ مناظرِ فطرت اور حیات و معاشرے پر مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔ مضمون نگاری میں تمہید، تفصیل اور اختتام کا اہتمام کیا جا سکتا ہے۔ مضمون ذہن کو متحرک اور فکر کو فعال کرتا ہے سنجیدگی اس کا مزاج ہے اور نتیجہ اخذ کرنا وتیرہ۔ خیالات منضبط کرنا مضمون نگاری کی امتیازی خصوصیت ہے۔ مضمون نگاری میں مضمون سے ہٹنے اور خیالات کے بھٹک جانے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ مضمون نگار گویا ناک کی سیدھ میں چلتا ہے۔

الف۔ انشائیہ سنجیدگی کا متحمل نہیں ہوتا۔ وہاں شگفتہ روی کو پسند کیا جاتا ہے۔

ب۔ انشائیہ نگار ذہنی فکر اور سوچ میں غلطاں دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے چہرے پر طمانیت چھائی رہتی ہے۔ قاری خود بھی انشائیہ پڑھ کر طمانیت محسوس کرتا ہے۔

ج۔ انشائیہ مرجھائے چہروں کو تبسم ریز کرتا ہے۔ انشائیہ نگار اور اس کا قاری فکر کو ہوا میں اڑاتا چلا جاتا ہے۔

د۔ گنجلک افکار کی انشائیے میں کوئی گنجائش نہیں ہوتی اور نہ وہ ثقالت کو پسند کرتا ہے۔

ح۔ انشائیے میں خیالات کی روانی بادِ سحر کے خوسگوار جھونکے کی مانند ہوتی ہے جس سے غنچۂ دل کھل اٹھتے ہیں۔

ط۔ انشائیہ ایسی ہلکی پھلکی تحریر ہے جو سبب انشراحِ طبائع ہوتی ہے۔

و۔ انشائیہ تھکے ماندے ذہنوں کے لیے سامانِ انبساط ہے۔

ھ۔ انشائیہ میں نہ طنز کی کیفیت ہوتی ہے نہ مزاح کی۔ مگر ان دونوں کے امتزاج سے قاری کو گدگدانے والی چٹکی کا احساس ضرور ہوتا ہے۔

ی۔ انشائیے میں جذبات لطیف، خیالات لطیف، احساسات لطیف حتیٰ کہ زبان اور اس کی لفظیات وتراکیب میں بھی لطافت کا عنصر غالب رہتا ہے۔

سلام بن رزاق:

سوال : گزشتہ دنوں ایک افسانہ نگار نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ہمارے بیشتر افسانے انشائیوں کی طرح لکھے جا رہے ہیں، کیا آپ اس سے متفق ہیں؟

جواب : پچھلے سوسوا سو برسوں میں اردو مختصر افسانہ کئی نشیب و فراز سے گزرا ہے۔ تکنیک اور اسلوب کے اعتبار سے بھی اس میں کئی تجربات کیے گئے۔ ان تجربوں میں بعض یقیناً اردو افسانے کے سفر میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن جدیدیت کے دور میں ایسے افسانے بھی لکھے گئے جن میں ماجرے کے بجائے محض عبارت آرائی کو روا رکھا گیا۔ اس طرح افسانہ انشائیے سے قریب ہوتا چلا گیا، لیکن وہ ایک عبوری دور تھا جو دس پندرہ سال میں اپنے انجام کو پہنچ گیا مگر اس کے اثرات کو زائل ہونے میں ایک عرصہ لگ گیا۔

جہاں تک میرا خیال ہے فی زمانہ کوئی افسانہ نگار ایسے افسانے نہیں لکھ رہا ہے جس پر انشائیے کا گمان ہو، البتہ اکیسویں صدی میں جو نئی نسل ابھر کر سامنے آئی ہے وہ واٹس ایپ، فیس بک، اور انٹرنیٹ کی دلدادہ ہے۔ سب جانتے ہیں کہ سوشل میڈیا کا جادو نئی نسل کے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ نیا افسانہ نگار کچے پکے افسانے اور افسانچے لکھ کر ادب میں ہفت خواں طے کر لینا چاہتا ہے، لہٰذا افسانے تو خوب لکھے جا رہے ہیں مگر معیار اور فن مفقود ہے۔

سوال : افسانے اور انشائیے میں کیا فرق ہے؟

جواب : یوں تو ہمارے معتقدین نے افسانے اور انشائیے کی بے شمار تعریفیں بیان کی ہیں یہاں انہیں دہرانا تحصیل حاصل ہے تاہم مختصراً عرض کیا جا سکتا ہے کہ افسانے کی تعمیر میں ماجرا، پلاٹ، کردار نگاری، فضا سازی مکالمے گارے مٹی کا کام کرتے ہیں، اردو ہی نہیں دیگر زبانوں کے بہترین افسانوں پر بھی ایک نظر ڈالی جائے تو ان کی تعمیر و تکمیل میں یہی اجزا کار فرما نظر آئیں گے۔ لیکن انشائیہ ایک ایسا شہ پارہ ہے جس میں انشائیہ نگار خیال کی ڈور پکڑ کر آسمانِ تخیل کی جولانیاں ناپتا ہے اور خود اکتشافی کیفیت سے سرشار ہوتا ہے اگرچہ آزاد تلازمۂ خیال بھی اس کی ایک خصوصیت ہے تاہم انشائیہ نگار اپنی نگاہ سے اس نکتے کو اوجھل نہیں ہونے دیتا جو اس کی فکر کا مقصود ہے۔

ڈاکٹر صفدر:

سوال : انشائیہ میں تخلیقی اظہار کے زبردست امکانات ہیں اس بیان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب : وہ تخلیقی عنصر جو مضمون، آپ بیتی، طنز و مزاح، خطوط، داستان اور افسانے میں رچ بس کر ان کی شان بڑھاتا ہے، اسے پہچان کر اس تخلیقی عنصر کو الگ کر کے اہلِ قلم نے ایک نئی شناخت دی ہے، وہ انشائیہ ہے۔

انشائیے کے تعلق سے تعصّبات، ضد، مفروضات اور ذاتی پسند و ناپسند کی برف

اب پگھلی جاتی ہے۔اتنا تو ضرور ہوا ہے کہ اب انشائیہ کو ایک صنف کے طور پر قبول کرلیا گیا ہے۔ایک کنفیوژن ہنوز باقی ہے۔لوگوں کو اب بھی انشائیہ کی علاحدہ شناخت کو منظور کرنے میں تامّل ہے۔طنزیہ مزاحیہ مضامین کو انشائیہ کہہ دیا جاتا ہے۔پطرس کے مضامین عرصہ تک ’مضامینِ پطرس‘ کے نام سے شائع ہوتے اور پڑھے جاتے تھے۔مگر آج انھیں انشائیہ کہا جانے لگا ہے۔
ذی حیات مظہر سے مادّہ ٔحیات کو علاحدہ شناخت کر کے اسے زندہ جسم کی جین کہا گیا ہے ۔ اسی طرح مضمون ، آپ بیتی ،سفر نامہ ، خطوط، داستان اور افسانے میں موجود انشائی عنصر کو پہچان کر اور الگ کر کے اہلِ قلم نے نئی بیانیہ صنف دریافت کی ہے ،یہ انشائیہ ہے ۔ انشائیہ نگار زیرِ قلم مظہر کے پوشیدہ گوشوں کو حیطۂ اظہار میں لاتا ہے۔غالبؔ سے مدد لے کر انشائیہ نگار اپنی کار گزاریوں کو یوں بیان کرسکتا ہے۔

میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

انشائی اظہار ناموجود کو وجود میں لانا ہے۔اس تخلیقی کاروائی کو انگریزی میں A loose sally of mind کہا گیا ہے۔ایک تخلیقی جست کے ذریعے انشائیہ نگار مخفی معنوی حدود میں پہنچتا ہے اور نئے معنوی گوہر نکال لاتا ہے۔کنفیوژن یہ ہے کہ انشائیہ کو قبول کرلیا گیا ہے۔مگر مضمون سے خلط ملط کرنے کا رویہ عام ہے۔یہ بات بھی قبول کرلی گئی ہے کہ نشائیہ پڑھنے میں مزہ بہت آتا ہے۔انشائیہ سراسر تخلیقی مظہر ہونے کے سبب قاری کو متحیر وجود میں تبدیل کر دیتا ہے۔انشائیہ پڑھتے ہوئے ایک نئی دنیا، ایک نئی کائنات قاری کے روبرو ہوتی ہے۔

ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو

انشائیہ معلوم اور موجود ہیئت کا بھی انکار کرتا ہے ۔ بے ہیئتی ہی انشائیے کی ہیئت ہے۔ایک بار انشائیے کی بے ہیئتی قلم کار کی گرفت میں آ گئی تو اسے معنی کے نئے پیکر گرفت کرنے میں آسانی ہوتی جاتی ہے۔چونکہ انشائیہ سرتاسر نئے معنوی پیکروں سے عبارت ہے اس لیے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ انشائیے میں تخلیقی اظہار کی بے پناہ قوت موجود ہے۔
انشائیہ نگار مسلسل نئے تخلیقی نکتے بیان کرتا جاتا ہے۔اس اعتبار سے انشائیہ غزل کے قریب ہے۔غزل گو قافیے کے جال میں پھنس کر منظوم بیانات بھی جاری کرنے لگتا ہے۔اس لیے غزل میں بھرتی کے اشعار بھی در آتے ہیں ۔انشائیہ نگار کو یہ مجبوری لاحق نہیں ہوتی ۔اسے انشائیے کا پیٹ بھرنے کے لیے مظاہر کی فوٹو گرافی سے سمجھوتا نہیں کرنا پڑتا، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ انشائیے میں تخلیقی اظہار کے زبردست امکانات موجود ہیں۔

سوال :انشائیے میں اظہارِ ذات کی نوعیت کیا دیگر اصنافِ ادب سے مختلف ہے؟

جواب :ادب کی تمام اصناف میں تخلیقی جوہر کی رونمائی کا وسیلہ اظہارِ ذات ہی ہے ۔تخلیقی اپروچ فنکار کی انفرادی کاوش ہوتی ہے۔فنکار کی ذات میں موجودات سے پرے پہنچنے کی قوت، اس کی ذات کے پھیلاؤ کے بقدر ہوتی ہے۔تخیل کی تخلیقی جست اظہارِ ذات کو توانائیاں عطا کرتی ہے۔
یہ کہنا درست نہیں کہ ادب کی دیگر اصناف تخلیقی جوہر سے عاری ہوتی ہیں۔ادب کی ہر صنف تخیلی تخلیقی جست سے وجود میں آتی ہے۔فنکار کی ذات میں جس قدر ہمہ گیری ہوگی، فن پارہ اسی قدر تخلیقی توانائی کا حامل ہوگا۔گلشنِ نا آفریدہ کو طول و عرض کا گھیراؤ ذات کے پھیلاؤ کے بقدر ہوتا ہے، اس لیے میں یہ نہیں مانتا کہ دیگر اصنافِ ادب میں اظہارِ ذات کی نوعیت انشائیہ سے مختلف ہوتی ہے۔اظہارِ ذات تمام اصناف میں مشترک ہے۔یہ خوبی سب سے چھین کر

انشائیے کی جھولی میں ڈال دینا مناسب نہیں ہے۔

میں یہ بھی مانتا ہوں کہ انشائیے کو تمام اصنافِ ادب کا سرتاج بنا دینا بھی غیر ادبی رویہ ہے۔ اظہارِ ذات کے بہانے بقراطیت انشائیے کے سر منڈھنے کی روش بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔ انشائیے نے شگفتگی بھی مضمون نگاروں سے سیکھی ہے۔ انشائیے کو بقراطیت کے حوالے کرنا بھی انشائیہ کے حق میں نہیں ہوگا۔

شکیل اعجاز:

سوال :انشائیے کی متعدد تعریفیں پیش کی گئی ہیں پھر بھی لوگ مطمئن نہیں ہیں، کسی نے کہا ہے کہ کثرتِ تعبیر نے اسے ایک خوابِ پریشان بنا دیا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب :اچھا انشائیہ جھلساتی ہوئی دھوپ میں دن گزارنے کے بعد ڈسکو سنگیت کے شور شرابے میں ٹھنڈا میٹھا کلاسیکل سنگیت ہے۔ اسکول اور کالج کی بے باک اور باتونی لڑکیوں کے درمیان یہ ایک خوش شکل، خوش ادا، باحیا، باوقار، معاملہ فہم، پڑھی لکھی، ذہین لیکن کم سخن لڑکی ہے جو کم ملاقاتیں کرتی ہے لیکن جب بھی ملتی ہے اس کی دھیمی شیریں آواز دلکش لفظوں کے انتخاب کے سبب اس کے وجود کی مہک سے دل و دماغ پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہ بہت اپنی محسوس ہوتی ہے کیونکہ یہ زمانے بھر کی خبریں، اپنی قابلیت اور کارنامے سنا سنا کر بور کرنے کی بجائے اپنے دل کی کیفیتیں بیان کرتی ہے۔ اس کے خیالات اتنے نازک ہیں جیسے پھول کی پنکھڑی کی رگیں اپنی خوش حالی کے قصے سنا رہی ہوں۔

اس کی محبت آب و ہوا کی تبدیلی کا احساس دلاتی ہے۔ اس کی باتیں اگست کے مہینے میں ٹھنڈی نشیلی ہواؤں کے جھونکوں کے درمیان تھم تھم کر ہونے والی بارش ہے۔ بولتے بولتے رک جاتی ہے تب بھی محسوس ہوتا ہے کہ اس گھنے جنگل میں تازے ہرے پتوں سے بارش کی بوندیں ٹپک رہی ہیں اور دور کہیں ندی کے بہنے کی آواز آ رہی ہے۔

ہمارے بزرگوں نے، اچھا انشائیہ کیا ہے، یہ سمجھانے کے لیے بہت کوششیں اور محنتیں کی ہیں۔ ان کی باتوں کا لب لباب یہ ہے کہ انشا کی توانائی دراصل خیال کی تازگی و تنومندی سے ظاہر ہوتی ہے۔ انشائی قوت سے بات میں بات پیدا ہوتی ہے اور خیالات کی لہریں نکلتی ہیں۔ انشائیہ وہ ہے جس میں مغز و مضمون کی اصل توجہ حسن حسنِ عبارت پر ہو۔ اس میں کسی خاص موضوع کو لے کر اس کے گرد نثر نگار اپنے جذبات و احساسات کا تارِ عنکبوت بنتا جاتا ہے۔ ہمارا انشائیہ عصری زندگی کی سچائیوں کا ایسا مبصر ہے جو طنز و تعریض اور مزاح کے ذریعے تفریح مہیا کرنے یا اس عہد کے قبیح چہرے کو قبیح تر بنا کر پیش کرنے یا اس کے بے ہنگم، بے ڈول رویوں پر قہقہے لگانے کا کام نہیں کرتا بلکہ ہمہ جہت حقائق کی ان جہتوں کو روشنی میں لانے کا اہتمام کرتا ہے جو عام نظروں سے اوجھل ہیں۔ وزیر آغا نے انگریزی کے Light Essay اور Persona, Essay کے خطوط پر جو تخلیقات پیش کی ہیں اور ان ہی کی بنیاد پر انشائی نگاری کی جو تحریک چلائی ہے ان تحریروں پر وہ عصری انشائی کا اطلاق کرتے ہیں حالانکہ اس عصری انشائیے کے بہت پہلے سے اردو میں انشائیہ موجود رہا ہے۔ جارج سینٹ بری کے نزدیک انشائیہ ایک ایسے دلچسپ قسم کے آدمی کی گفتگو ہے جسے ہر قسم کی معلومات ہے اور انداز ایسا جو عام طور پر کھانے کے بعد پر لطف بات چیت کا ہوا کرتا ہے۔

ہندوستان سے انشائیہ نگاری کی تحریک میں شامل ہونے والے تین اہم ادیبوں میں ایک نام محمد اسد اللہ کا ہے انھوں نے محض انشائیے رقم کرنے کے

بجائے اس پر مضامین اور کتابیں لکھیں ہیں۔ ان کی کتاب 'اردو انشائیے کی روایت، مشرق ومغرب کے تناظر میں'، ان کا ایک ادبی کارنامہ ہے۔ ان کے انشائیوں کے مجموعے 'بوڑھے کے رول میں' کے پیش لفظ میں اسداللہ کا یہ جملہ انشائیے کو سمجھنے میں بہت آسانی پیدا کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں : قلم سنبھالتے ہی مجھے ذاتی قسم کے احساسات کی تخلیقی صورت گری کے لیے مناسب ذریعۂ اظہار کی جستجو ہوئی اور نظر انتخاب انشائیے پر پڑی۔ محمد اسداللہ کے اس جملے سے بھی پتہ چلتا ہے کہ انشائیہ باطن کی سیاحت ہے۔ یہ منصوبہ بند سوچ نہیں بلکہ بکھری ہوئی لیکن دلچسپ سوچ ہے۔

انشائیہ کیا ہے یہ ہم بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں اگر ہم یہ جاننے کی کوشش کریں کہ انشائیہ کیا نہیں ہے۔ انشائیہ مسلمات کا بیان نہیں بلکہ شخصی نکتۂ نظر کا اظہار ہے اسی لیے گھسے پٹے انداز، چبے چبائے الفاظ اور مخصوص فکر سانچوں سے گریز موضوع سے منحرف ہو کر اس کے اچھوتے پہلو بے نقاب کرنا انشائیہ نگار کا طریقۂ کار ہے۔ بقول اسداللہ یہ محض ذاتی معاملات یا تجربات کی فہرست سازی کا کام نہیں، زندگی کے متنوع مظاہر کی فنکارانہ پیش کش ہے۔ ہمارے ہاں انشائیے کو محض ذاتی تجربات اور مشاہدات کا کچا چٹھا بیان کر دینے کا سیدھا سادہ عمل خیال کرلیا گیا ہے۔ یہ محض دفترِ معمولات نہیں۔ Lightness انشائیے کی زبان اور خوبی ہے لیکن یہ محض Lightness نہیں بلکہ زندگی کے بارے میں فلسفیانہ سوچ اور زندگی پر گہری نظر کا عکاس بھی ہے۔

سوال : کیا ایک طنزیہ ومزاحیہ مضمون اور انشائیے میں فرق ہے؟

جواب : مضمون معلومات پر مبنی ہوا کرتا ہے جبکہ انشائیہ کیفیت کا حامل ہوتا ہے۔ معلومات ہر خاص وعام آسانی سے قبول کرلیتا ہے، ہضم کرلیتا ہے اس میں اس کے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں پڑتا۔ اس لیے ادبی مضمون سے پیار کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔ جب کہ کیفیت (انشائیے) کو محسوس کرنے کے لیے ذہن کا تربیت یافتہ ہونا ضروری ہے۔ لکھنے کے لیے بھی اور پڑھنے کے لیے بھی۔ جسے ہم 'مستند قلم کار' کہتے ہیں ویسے ہی انشائیہ کے لیے بھی 'مستند قاری' کا ہونا بھی ضروری ہے۔ مضمون یا مقامے کی بندش مصنف کو یہ اجازت نہیں دیتی کہ وہ نفسِ مضمون سے بہت دیر کے لیے دوری اختیار کرے جب کہ انشائیے میں بے ترتیبی اپنا الگ حسن ایجاد کرتی ہے۔ انشائیے میں سوچ کا آزادانہ بہاؤ پایا جاتا ہے۔ انشائیہ نگار جب لکھنے بیٹھتا تو اس کے آگے انشائیے کا خاکہ واضح طور پر موجود نہیں ہوتا۔ طنز ومزاح ایک شعوری کاوش کے طور پر تحریر کی مجموعی فضا پیدا کرتا ہے جو اس کے مخصوص ارادوں اور مقاصد کی نمائندگی کرتا ہے۔

انشائیہ کے تعارف میں عموماً یہ کہ جاتا ہے کہ ایک غیر رسمی دوستانہ بات چیت ہے۔ یہ Light Essay ہے۔ (یعنی ذہن پر بوجھ نہیں ڈالتا) یہ اپنے خیالات کا ڈھیلا ڈھالا اظہار ہے۔ لیکن عصری انشائیہ پڑھنے کے بعد لگتا ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ انشائیہ کے بعض لکھنے والوں نے اسے اس نئے پڑھنے والوں ک لیے مشکل بلکہ تکلیف دہ بنا دیا ہے۔ محمد اسداللہ کو اس کا احساس ہے وہ لکھتے ہیں کہ 'عام قاری کی نظر میں نئے انشائیہ نگاروں کی تحریروں کے تئیں ایک بیزاری کا رجحان نمایاں ہے۔ یوں بھی اردو کے تخلیقی ادب کے قارئین کا حلقہ دن بہ دن سکڑتا جا رہا ہے۔

ہمارا نیا قاری جس نے اردو کا کلاسیکی ادب زیادہ نہیں پڑھا، زبان پر گرفت بھی ڈھیلی ہے اس کے لیے انشائیہ خصوصاً عصری انشائیہ 'زود ہضم کی بجائے ثقیل ثابت ہوتا ہے۔ اس کے لیے انشائیہ 'محفل میں بات چیت کرنے والا ایک ایسا شخص ہے جو دیر سے سمجھ میں آنے والی باتیں کرتا ہے اور اس پر خوش ہوتا

ہے کہ میری باتیں ہر کس و ناکس کی سمجھ میں آنے والی نہیں ہیں ۔لوگ اس آدمی کی محفل میں آ کر بیٹھ تو جاتے ہیں لیکن باتیں سن کر ان کی طبیعت اچاٹ ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس مضمون اور خصوصاً طنزیہ ومزاحیہ مضمون ایسا شخص ہے جو جلد سمجھ میں آنے والی، بالکل آس پاس کی اور ایسی دلچسپ باتیں کرتا ہے کہ لوگ خوش ہو جاتے ہیں، اپنے غم بھول جاتے ہیں۔ ہنستے اور لطف اٹھاتے ہیں اور آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ بھی اس محفل میں آ کر آخر تک بیٹھے رہتے ہیں۔ ہاں ان میں معمولی سوجھ بوجھ والے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے اس میں دو رائے نہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر انشائیے کو زندگی کی گہری اور فلسفیانہ سوچ کہنے میں حق بجانب ہیں لیکن مسئلہ بھی یہی ہے کہ ہمارے ہاں بہت اعلیٰ درجے کی اور گہری باتوں میں عوام کو دلچسپی نہیں ۔آرٹ فلمیں بڑے بڑے اوارڈ حاصل کرتی ہیں مگر بزنس نہیں کرتیں یہی وجہ ہے کہ وزیر آغا والا انشائیہ کوششوں کے باوجود قارئین میں زیادہ مقبول نہ ہو سکا وہ اب بھی مخصوص لوگوں کی چیز بنا ہوا ہے۔ ماڈرن آرٹ اعلیٰ درجے کی چیز تسلیم کیا گیا ہے، لاکھوں میں بکتا ہے لیکن عوام کی سمجھ میں نہیں آتا۔ Realistic Art کے خریدار کم ہیں لیکن عام لوگوں میں اس کی چاہت بہت ہے ۔ انشائیہ ماڈرن آرٹ ہے ۔ طنزیہ مزاحیہ مضمون Realistic Art ہے۔

○○○○

انشائیہ شناسی

پروفیسر سید احتشام حسین

پیش لفظ: صنف انشائیہ اور انشائیے

اگر میں یہ پیش لفظ اس اعتراف سے شروع کروں کہ میرے ذہن میں انشائیہ کی کوئی منطقی اور علمی تعریف نہیں ہے تو یقیناً مجھ پر لاعلمی اور جہالت کا الزام نہیں لگایا جائے گا کیونکہ میں خود ان تمام مشرقی اور مغربی نقادوں کو شک کی نظر سے دیکھتا رہا ہوں جنھوں نے قطعیت کے ساتھ اس کی تعریف کی ہے اور اسی کو صحیح اور مناسب ترین قرار دیا ہے لیکن اس کا مقصد یہ بھی نہیں ہے کہ میرے ذہن میں انشائیہ کا کوئی تصور ہی نہیں۔ یہ تصور کسی منطقی تعریف کی شکل میں نہیں، ایک علمی تاثر کی شکل میں میری ذہنی کرید کے افق پر جھلملاتا رہا ہے اور جب میں اسے لفظوں میں اسیر کرنا چاہتا ہوں تو وہ گرفت میں نہیں آتا۔ شاید یہی فرق ایک علمی یا معلوماتی مضمون اور انشائیہ میں بھی ہو۔ ایک میں قطعیت، استدلالی انداز، معلوماتی بے رنگی اور نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش ہوتی ہے اور دوسرے میں افکار و مسائل کی تاثراتی رنگینی۔ اس لیے میں یہ غلطی نہیں کروں گا کہ انشائیہ کی کوئی تعریف پیش کروں۔ اس کام میں کچھ ادیب مجھ سے زیادہ مستعدی اور لگن کے ساتھ منہمک ہیں۔

گذشتہ چند سالوں سے اردو کے کچھ ادیب خاص طور سے انشائیہ کے حدود متعین کرنے کی کوشش میں ہیں۔ ان میں سے بعض نے خود بھی انشائیے لکھے ہیں اور گویا اس بات کا عملی ثبوت فراہم کیا ہے کہ ان کے خیال میں انشائیہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ کچھ ایسے ہیں جو اپنے ذوق و تصور کے مطابق انشائیے لکھ رہے ہیں لیکن اس فکر میں نہیں کہ وہ انشائیہ کی تعریف بھی کریں۔ یہ وہ ہوشیار لوگ ہیں جن کو آم کھانے سے کام ہے، گٹھلیاں گننے کا کام وہ دوسروں کے سپرد کرنا چاہتے ہیں یا اکبر الہ آبادی کی زبان میں یہ کہنا چاہتے ہیں۔

شعر میں کہتا ہوں بچّے تم کرو

جو طریقِ کار بھی زیادہ محتاط اور محفوظ ہو کسی نہ کسی کو تو یہ کام کرنا ہی ہے کہ وہ مختلف اصنافِ ادب میں سے اس صنف کو چھانٹ کر الگ کرے جسے عرفِ عام میں انشائیہ کہا جاتا ہے اور جب اس کی شکل و صورت پہچانی جانے لگے تو اچھے اور برے انشائیوں کے حسن و قبح پر غور کرنے کے طریقے بھی بتائے۔ یہ کام ڈاکٹر سید محمد حسنین نے بڑی محنت سے انجام دیا ہے۔ انھوں نے دو درجن سے زیادہ انشائیوں کا انتخاب کر کے اس پر ایک معلوماتی اور دلچسپ مقدمہ لکھ کر ظاہر کیا ہے کہ اردو میں بھی کچھ اچھے انشائیے لکھے گئے ہیں اور ان انشائیوں کو مضمون، مقالہ، روداد، اداریہ، خاکہ، رپورتاژ، صحافتی مضامین اور روزنامچہ سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ ان کی یہ کوشش مستحسن ہے اگرچہ اس سے بھی بحث کے وہ تمام دروازے بند نہیں ہوتے جو نقادانہ موشگافیوں سے کھلتے ہیں اور مغرب و مشرق کے نقاد جن کے حل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

انشائیہ محض ذاتی تاثر ہے یا فلسفیانہ خیال آرائی، محض انشا پردازی کا طلسم ہے یا معنی خیز اظہارِ خیال، محض سرسری اور سادہ اظہارِ تاثر ہے یا رنگین اور فکر خیز ادبی تخلیق ... اس طرح کی بہت سی نازک بحثیں اٹھائی گئیں ہیں۔ اور اب تک کوئی آخری بات اس سلسلے میں نہیں کہی گئی ہے اگر کسی نے بحث مباحثے کے بعد کوئی نتیجہ نکال بھی لیا ہے تو اس پر پورے ہونے والے صرف چند مضامین ملے ہیں۔ جنھیں اپنے نقطہ نظر والے انشائیوں کی فہرست میں شریک کرنا مناسب سمجھا اور بات محض ذاتی پسند کی ہو کر رہ گئی۔ اگر کسی کو اس بحث سے دلچسپی ہو تو وہ وزیر آغا کی خیال پارے، نظیر صدیقی کی شہرت کی خاطر، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کا انتخاب، اردو ایسیز، مولوی صفی مرتضیٰ کی کتاب اردو انشائیہ، اور ادیب علی گڑھ کے انشائیہ نمبر (مرتبہ قمر رئیس) کا مطالعہ کرے۔ اس کی سمجھ میں کم سے کم بحث کے وہ سارے پہلو سامنے آجائیں گے جن کے جاننے کی ضرورت ہے۔

میرا خیال ہے کہ انشائیہ کی کوئی ایسی حد بندی نہیں ہونی چاہئے جو اچھے، خیال

انگیز، ادیبانہ اور آسودگی بخشنے والے ادب پاروں کو صرف اس بنا پر اس صنف میں شامل نہ ہونے دے کہ اس میں کوئی مخصوص بات جو کسی لغت یا کتاب میں انشائیہ کے بارے میں بتائی گئی ہے، نہیں ملتی۔ انشائیہ کی حد بندی کے باوجود ڈاکٹر سید محمد حسنین نے یہ مصنوعی اور خود ساختہ اندازِ انتخاب اختیار نہیں کیا ہے اور بہت سے اچھے مضامین یکجا کر دیے ہیں تاکہ طلبا کو اچھی نثر کے شگفتہ نمونوں سے واقفیت ہو جائے۔

الٰہ آباد ۱۹۶۳ء — پروفیسر سید احتشام حسین

OOOO

ڈاکٹر وزیر آغا

انشائیہ کیا ہے؟

انشائیہ کیا ہے؟... بادی النظر میں انشائیہ یا پرسنل ایسے کی حدود کو متعین کرنا ایک خاصا کٹھن کام ہے۔ کیونکہ نہ صرف تاریخی اعتبار سے انشائیہ کے مفہوم اور ہیئت میں کئی انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں بلکہ ہر انشائیہ کیا بہ لحاظ مواد اور کیا بہ لحاظ تکنیک ایک جداگانہ کیفیت کا حامل ہے۔ تاریخی اعتبار سے بیکن، لیمب، چسٹرٹن کے طریق کار میں اتنا تفاوت ہے کہ ان کے لکھے ہوئے مضامین کو ایک ہی زمرے میں شامل کرتے ہوئے سخت ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح دورِ جدید کے بیشتر لکھنے والوں نے انشائیہ کے سلسلے میں کافی سے زیادہ آزادی سے کام لیا ہے اور ناقد کے لیے انشائیہ کے مقتضیات اور امتیازی محاسن کو علیحدہ کر کے دکھانا مشکل ہو گیا ہے۔ تاہم غائر نظر سے دیکھنے پر انشائیہ کی متنوع کیفیات اور ابلاغ و اظہار کے مختلف سانچوں کے پس پشت ایک علاحدہ صنف ادب کے نقوش واضح طور پر ابھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور ہم ذرا کوشش سے انشائیہ کی حدود کو متعین اور محاسن کو بے نقاب کر سکتے ہیں۔

ایک چیز جو انشائیہ کو دوسری اصناف ادب سے ممیز کرتی ہے، اس کا غیر رسمی طریق کار ہے۔ دراصل انشائیہ کے خالق کے پیش نظر کوئی ایسا مقصد نہیں ہوتا جس کی تکمیل کے لیے وہ دلائل و براہین سے کام لے اور ناظر کے ذہن میں رد و قبول کے میلانات کو تحریک دینے کی سعی کرے۔ اس کا کام محض یہ ہے کہ چند لمحوں کے لیے زندگی کی سنجیدگی اور گہماگہمی سے قطع نظر کر کے ایک غیر رسمی طریق کار اختیار کرے اور اپنے شخصی ردعمل کے اظہار سے ناظر کو اپنے حلقہ احباب میں شامل کر لے۔ دوسرے لفظوں میں تنقید یا تفسیر کا

خالق اس افسر کی طرح ہے جو چست اور تنگ سالباس زیب تن کیے دفتری قواعد وضوابط کے تحت اپنی کرسی پر بیٹھا، احتساب اور تجزیے کے تمام مراحل سے گزرتا ہے اور انشائیہ کا خالق اس شخص کی طرح ہے جو دفتر سے چھٹی کے بعد اپنے گھر پہنچتا ہے، چست اور تنگ سالباس اتار کر ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن لیتا ہے اور ایک آرام دہ موڑھے پر نیم دراز ہو کر اور حقہ کی نے ہاتھ میں لیے انتہائی بشاشت اور مسرت سے اپنے احباب سے مصروف گفتگو ہو جاتا ہے۔ انشائیہ کی صنف اسی شگفتہ موڈ کی پیداوار ہے اور اس کے تحت انشائیہ کا خالق نہ صرف رسمی طریق کار کی بجائے ایک غیر رسمی طریق کار اختیار کرتا ہے بلکہ غیر شخصی موضوعات پر نقد وتبصرے سے کام لینے کی بجائے اپنی روح کے کسی گوشے کو بے نقاب اور اپنے شخصی ردعمل کے کسی پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ انشائیہ کے خالق کے پاس کئی ایک ایسی کہنے کی باتیں ہوتی ہیں جنھیں وہ آپ تک پہنچانے کی سعی کرتا ہے... اس طور کہ آپ فی الفور اس کے دائرۂ احباب میں شامل ہو جاتے اور اس کے دل تک رسائی پا لیتے ہیں۔ شاید اسے کوئی واقعہ بیان کرنا ہوتا ہے یا کسی 'ذہنی کیفیت' پر سے نقاب اٹھانا یا محض زندگی کے مظاہر کو ایک نئے زاویے سے پیش کرنا ہوتا ہے اور وہ اس صنف ادب کا سہارا لے کر اپنی شخصیت یا ذات کے کسی نہ کسی گوشے کو عریاں کرنے میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ بنیادی طور پر انشائیہ کے خالق کا کام ناظر کو مسرت بہم پہنچانا ہے۔ اس کے لیے وہ طنز سے کچھ زیادہ کام نہیں لیتا۔ کیونکہ طنز ایک سنجیدہ مقصد لے کر برآمد ہوتی ہے اور اس کے عمل میں نشتریت کا عنصر موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک اچھے انشائیہ میں طنز کبھی بھی مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ بلکہ محض ایک 'سہارے' کا کام دیتی ہے۔ اسی طرح انشائیہ کا خالق محض مزاح تک اپنی سعی کو محدود نہیں رکھتا۔ کیونکہ محض مزاح سے سطحیت پیدا ہوتی ہے اور بات قہقہہ لگانے اور ہنسنے ہنسانے سے آگے نہیں بڑھتی... اس کے برعکس ایک اچھا انشائیہ پڑھنے کے دوران میں آپ شاید حظ، مزاح، طنز، تعجب، اکتساب علم اور تخیل کی سبک روی، ایسے بہت سے مراحل سے روشناس ہوں لیکن انشائیہ کے خاتمے پر آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ نے زندگی کے کسی مخفی گوشے پر روشنی کا ایک نیا پرتو دیکھا ہے اور آپ زندگی کی عام سطح سے اوپر اٹھ آئے ہیں۔ کشادگی اور رفعت کا یہ احساس ایک ایسا متاع گراں بہا ہے جو نہ صرف آپ کو مسرت بہم پہنچاتا ہے بلکہ آپ کی شخصیت میں بھی کشادگی اور رفعت پیدا کر دیتا ہے۔

انشائیہ کی ایک اور امتیازی خصوصیت اس کی 'عدم تکمیل' ہے۔ ایک مقالہ لکھتے وقت جہاں یہ ضروری ہے کہ موضوع پر بحث کے تمام تر پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ کیا جائے اور تحلیل، تجزیہ اور دلیل سے اپنے نقطہ نظر کو اس انداز سے پیش کیا جائے کہ مقالہ ایک مکمل واکمل صورت اختیار کر لے وہاں انشائیہ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں موضوع کی مرکزیت تو قائم رہتی ہے لیکن اس مرکزیت کا سہارا لے کر بہت سی ایسی باتیں بھی کہہ دی جاتی ہیں، جن کا بظاہر موضوع سے کوئی گہرا تعلق نہیں ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں ایک مقالے کی بہ نسبت انشائیہ کا ڈھانچہ کہیں زیادہ لچکیلا (Loose) ہوتا ہے اور اس میں مقالے کی سنگلاخی کیفیت موجود نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ انشائیہ میں ایک مرکزی خیال کے باوصف دلائل کا کوئی منضبط سلسلہ قائم نہیں کیا جاتا اور انشائیہ کے مطالعہ کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ انشائیہ لکھنے والے نے موضوع کے صرف ان پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جو اس کے شخصی ردعمل سے اثر پذیر تھے اور جن کی نکیلی کیفیت اس بات کی متقاضی تھی کہ مصنف ان کو ناظر تک پہنچانے کی سعی کرتا۔ اس مقام پر ایک انشائیہ اور غزل کے ایک شعر میں گہری مماثلت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ غزل کے شعر کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کسی ایک نکتہ کو اجاگر تو کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے تمام تر پہلوؤں کو ناظر کے فکر وادراک کے لیے نامکمل صورت میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہی حال ایک انشائیہ کا ہے کہ اس میں موضوع کے صرف چند ایک انوکھے پہلوؤں کو پیش کر دیا جاتا ہے اور اس کے بہت سے دوسرے پہلو تشنہ اور نامکمل حالت میں رہ جاتے ہیں۔ بنیادی طور پر انشائیہ لکھنے والے کا مقصد آپ کی سوچ بچار کے لیے راستہ

ہموار کرنا ہے۔ بے شک وہ اپنے موضوع کے بیان میں صرف شخصی واردات اور تجربات اور اپنے ذاتی ردعمل کے اظہار تک ہی اپنی مساعی کو محدود رکھتا ہے۔ تاہم اس کے پیش نظر مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ آپ کو سوچنے پر مائل کرے۔ چنانچہ ایک اچھے انشائیہ کی پہچان یہ ہے کہ آپ اس کے مطالعہ کے بعد کتاب کو چند لمحوں کے لیے بند کر دیں گے اور انشائیہ میں بکھرے ہوئے بہت سے اشارات کا سہارا لے کر خود بھی سوچتے اور محظوظ ہوتے چلے جائیں گے۔

انشائیہ کی اس روش کا نتیجہ انشائیہ کی وہ مخصوص صورت بھی ہے جو اسے دوسری اصناف ادب سے ممیز کرتی ہے۔ یعنی ایک انشائیہ نثر کی دوسری اصناف سے اپنے اختصار کے باعث علیحدہ نظر آتا ہے۔ سانیٹ کی طرح انشائیہ کا بھی ایک مختصر سا میدان ہے جس کے اندر انشائیہ لکھنے والا آپ کو تصویر کا ایک مخصوص رخ دکھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک وہ جذبات، احساسات اور تخیلات میں کاٹ چھانٹ اور کفایت Economy کا قائل نہ ہو، اس کے لیے چند لفظوں میں موضوع کی سب سے نکیلی کیفیات کو پیش کرنا مشکل ہوگا، لیکن اختصار کی یہ خصوصیت اس بات کے تابع ہے کہ انشائیہ کا پس منظر کس قدر شاداب یا بے آب و گیا ہے۔ چنانچہ بقول ہڈسن اگر انشائیہ لکھنے والے نے اس لیے اختصار سے کام لیا ہے کہ اس کے پاس کہنے کی باتیں ہی گنتی میں کم ہیں اور اس کے تجربات اور محسوسات تعداد اور شدت میں نہ ہونے کے برابر ہیں تو اس کا لکھا ہوا انشائیہ یقیناً انشائیے کے معیار پر پورا نہیں اترے گا۔ اس کے برعکس اگر انشائیہ لکھنے والے کا ذہن زرخیز ہے اور اس کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔ لیکن اس نے انشائیہ کی محدود سی دنیا میں اپنے احساسات اور تخیلات کو اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی سعی کی ہے تو اس کا یہ انشائیہ یقیناً ایک قابل قدر چیز ہوگا اور ناظرین کو وہ تمام کیفیات مہیا کرے گا جو انشائیہ سے مخصوص ہیں۔

ایک آخری چیز جسے انشائیہ کا امتیازی وصف سمجھنا چاہیے۔ اس کی 'تازگی' ہے۔ یوں تو تازگی ایک ایسی خصوصیت ہے جس کے بغیر کوئی بھی صنف ادب فن کے اعلیٰ مدارج تک نہیں پہنچ سکتی۔ تاہم شاید انشائیہ ہی ایک ایسی صنف ادب ہے جس میں نہ صرف تازگی کا سب سے زیادہ مظاہرہ ہوتا ہے، بلکہ جس کی ذرا سی کمی بھی انشائیہ کو اس کے فنی مقام سے نیچے گرا دیتی ہے۔ تازگی سے مراد محض اظہار و ابلاغ کی تازگی نہیں۔ کیونکہ یہ چیز تو بہرحال انشائیہ میں موجود ہونی چاہیے۔ تازگی سے مراد موضوع اور نقطہ نظر کا وہ انوکھا پن بھی ہے جو ناظر کو زندگی کی یکسانیت اور ٹھہراؤ سے اوپر اٹھا کر ماحول کا از سر نو جائزہ لینے پر مائل کرتا ہے۔ عام طور پر ہم سب زندگی کے مظاہر کو ہر روز دیکھتے دیکھتے ان کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ ہمیں ان کے بہت سے نکیلے کنارے نظر ہی نہیں آتے اور زندگی ہمارے لیے ایک کھلی ہوئی کتاب کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب محض ہمارے ردعمل کا قصور ہے ورنہ زندگی کے دامن میں نئے پہلوؤں کے قحط کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انشائیہ لکھنے والے کا کام یہ ہے کہ وہ ہمیں ایک لحظہ کے لیے روک کر زندگی کے عام مظاہر کے ایسے تازہ پہلو دکھاتا ہے، جنھیں ہماری نظروں نے اپنی گرفت میں نہیں لیا تھا اور جو ہمارے لیے گویا موجود ہی نہیں تھے۔ اس مقام پر ایک انشائیہ لکھنے والے اور ایک غیر ملکی سیاح کے رجحان میں قریبی مماثلت بھی دکھائی دیتی ہے کہ جس طرح ایک سیاح کو کسی نئے ملک کی بہت سی ایسی انوکھی باتیں فوراً معلوم ہو جاتی ہیں جو اہل وطن کی نظروں سے اوجھل ہوتی ہیں۔ اسی طرح ایک انشائیہ لکھنے والا زندگی کے عام مظاہر کے ان تازہ پہلوؤں کو دیکھ لیتا ہے جو زندگی میں سطحی دلچسپی کے باعث ایک عام انسان کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔

زندگی کی ان انوکھی اور تازہ کیفیات کا احساس دلانے کے لیے انشائیہ کا خالق کئی ایک طریق اختیار کرنا جانتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ بلندی پر سے زندگی کے بظاہر اعلیٰ اور بلند مظاہر کی پستی کا ایک تصور قائم کرتا ہے یا ایک شریر آئینے میں سے ماحول کا بگڑا ہوا منظر دکھاتا ہے یا پھر زندگی کے تسلیم شدہ قواعد و ضوابط پر نظر ثانی سے ہمیں چونکانے

لگتا ہے۔ بہرصورت اس کا کام تصویر کا دوسرا رخ پیش کرنا ہے اور ہمیں عادت اور تکرار کے حصار سے لحظہ بھر کے لیے نجات دلانا ہے تا کہ ہم غیر جانبدارانہ طریق سے زندگی کے روشن اور تاریک رخ کا جائزہ لے سکیں۔ واضح رہے کہ انشائیہ کا خالق کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرتا اور ورنہ مشورہ ہی دیتا ہے اس کے علاوہ وہ کوئی مکمل نقطہ نظر پیش کرنے، اصلاح دینے یا اپنے شدید جذباتی ردعمل سے آپ کو متاثر کرنے سے بھی اجتناب کرتا ہے۔اس کا کام محض ایک عام چیز کے کسی انوکھے اور تازہ پہلو کی طرف آپ کو متوجہ کرنا ہے اور آپ کو ایک مخصوص انداز سے سوچنے کی ترغیب دینا ہے۔ مثال کے طور پر انگریزی انشائیوں کے عنوانات دیکھئے کہ کس طرح انشائیہ لکھنے والے نے زندگی کی عام ڈگر سے ہٹ کر زندگی کے دیوانہ وار بڑھتے ہوئے قافلے پر ایک نظر ڈالی ہے اور ایک انوکھی صنف ادب کا سہارا لے کر ناظر کو بھی اپنے تجربے میں شامل کرلیا ہے۔عنوانات ہیں:

☆ In Praise of Mistakes (Robert Lynd)
☆ On the Pleasure of No Longer Being Young (G. K. Chesterton)
☆ Why Distant Objects Please (Hazlitt)
☆ On the Ignorance of the Learned (Hazlitt)

یہ عنوانات اس بات پر دال ہیں کہ انشائیہ کا خالق اپنے موضوع کے انتخاب میں جدت سے کام لیتا ہے۔تاہم بات یہیں ختم نہیں ہوجاتی کیونکہ انشائیہ کے مطالعہ کے بعد ناظر کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ چند لمحوں میں حظ، تعجب اور مسرت کی بہت سی منازل طے کر آیا ہے۔ انشائیہ کی امتیازی صورت ایک بڑی حد تک اسی 'خوشگوار تازگی' کی رہین منت ہے۔

انشائیہ کے بنیادی محاسن کو اجاگر کرنے کے بعد قدرتی طور پر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اردو میں انشائیہ کی صنف کے بارے میں تحقیق کی جائے تا کہ معلوم ہو سکے کہ اردو انشائیہ نے اب تک کیا ترقی کی ہے اور مستقبل میں اس کے فروغ وارتقا کے کیا امکانات ہیں۔لیکن جب اردو انشائیہ کا جائزہ لیا جائے تو مایوسی کا سامنا ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض ناقدین ادب نے اردو انشائیہ کے تاریخی اور تدریجی ارتقا کو مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو میں انشائیہ کے وجود کو ثابت کرنے کی دھن میں انھوں نے کسی قابل قدر تحقیقی سرگرمی کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ ہر قسم کے طنزیہ مضامین یا غیر شخصی سنجیدہ نگارشات کو انشائیہ کا نام دے کر محض خود کو تسلی دینے کی سعی کی ہے۔ فی الواقع اردو میں تاحال انشائیہ کی صنف بطور ایک تحریک کے معرض وجود میں نہیں آئی۔ کہیں ایک آدھ چیز ایسی مل جاتی ہے جسے ایک لحظہ کے لیے انشائیہ کے تحت شمار کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن پھر فوراً ہی بعض نقائص کے پیش نظر یہ ارادہ ترک کرنا پڑتا ہے۔سرسید احمد خاں کے بعض مضامین کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ہم انہیں انشائیہ کے تحت شمار کرسکتے ہیں۔لیکن میری دانست میں ایسا کرنا درست نہیں۔ کیونکہ سرسید کے بیشتر مضامین میں ایک تو سنجیدہ مباحث کا انداز ملتا ہے، جو انشائیہ میں نہیں ہونا چاہیے۔دوسرے انداز بیان میں وہ تخلیقی تازگی نہیں جو انشائیہ کا بنیادی وصف ہے۔تیسرے ان مضامین میں سرسید نے اپنی ذات کے کسی نامعلوم گوشے کو عریاں کرنے کی بجائے خارجی زندگی کے واقعات اور مسائل کو نمایاں کیا ہے۔ چنانچہ ہم ان مضامین کو انشائیہ کے زمرے میں شامل نہیں کرسکتے۔ سرسید کے بعد انشائیہ کے ضمن میں سجاد حیدر یلدرم اور خواجہ حسن نظامی کے نام عام طور سے پیش کیے جاتے ہیں۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان اہل قلم نے انشائیہ نویسی کی صلاحیت کے باوصف، اس صنف ادب کا کوئی صحیح نمونہ پیش نہیں کیا۔

سجاد حیدر یلدرم کا مضمون 'مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ' کا ذکر ہوسکتا ہے۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ یہ مضمون اوریجنل نہیں بلکہ ماخوذ ہے۔سجاد حیدر یلدرم کے بعض

دوسرے مضامین میں کہیں کہیں انشائیہ نویسی کے تیور ضرور ملتے ہیں لیکن ان میں سے شاید ایک مضمون بھی ایسا نہیں ہے جسے 'انشائیہ' کے طور پر پیش کیا جا سکے۔ خواجہ حسن نظامی کے ہاں بھی انشائیہ نویسی کا رجحان تھا اور وہ ایک انشائیہ نویس کی طرح زندگی کے بظاہر غیر اہم موضوعات پر قلم اٹھانے پر بھی مائل تھے۔ (مثلاً مچھر وغیرہ پر ان کے مضامین) لیکن ان تمام مضامین میں انشائیہ کی دو اہم خصوصیات کا فقدان ہے۔ ایک تو ان مضامین کا لہجہ انشائیہ کے لہجے سے ہم آہنگ نہیں۔ دوسرے ان میں مصنف کی اپنی ذات یا شخصیت اجاگر نہیں ہوئی۔ چنانچہ یہ مضامین انشائیہ کے تحت شمار نہیں ہو سکتے۔ فرحت اللہ بیگ کے ہاں وہ بہت سی باتیں ملتی ہیں، جو انشائیہ کا امتیازی وصف قرار پا چکی ہیں۔ مثلاً شگفتہ انداز نگارش اور موضوع سے مصنف کا گہرا تعلق وغیرہ۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ فرحت اللہ بیگ کے ہاں بھی دوسرے کرداروں کی عکاسی یا واقعات کا بیان ہی انشا کا غالب ترین عنصر ہے اور اسی لیے وہ بھی اپنی ذات کے کسی گوشے کو عریاں نہیں کرتے۔ 'نذیر احمد کہانی' اور 'پھول والوں کی سیر' اردو ادب میں زندہ رہنے والی تخلیقات ضرور ہیں لیکن انہیں انشائیہ کے طور پر پیش کرنا بے حد مشکل ہے۔

جدید دور میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف 'غبار خاطر' کے بعض ٹکڑے انشائیہ سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً چڑیوں کے سلسلے میں مولانا موصوف کے تجربات یا قہوہ کے بارے میں ان کا مخصوص ردعمل۔ ان ٹکڑوں میں پرشکوہ اسلوب نگارش کی بجائے مولانا نے ایک ایسا ہلکا پھلکا اور شگفتہ سٹائل اختیار کیا ہے جو انشائیہ کے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ افسوس ہے کہ مولانا نے اپنے اس مخصوص انداز میں کچھ زیادہ چیزیں تحریر نہیں کیں۔ اگر وہ اس صنف کی طرف سنجیدگی سے متوجہ ہوتے اور اپنی تحریروں سے انکشاف ذات کا کام بھی لیتے تو یقیناً انہیں انشائیہ کے ضمن میں ایک مقام امتیاز حاصل ہوتا۔۔۔ جدید دور میں مضمون نگاری کو بے شک اہمیت ملی ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ انشائیہ کی بجائے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ چنانچہ پطرس کے سارے مضامین مزاحیہ ہیں اور کنہیا لال کپور کے بیشتر مضامین طنزیہ ہیں۔ لیکن ان دونوں کے ہاں شاید ایک مضمون بھی ایسا نہیں جسے انشائیہ کے مزاج کا حامل کہا جا سکے۔ رشید احمد صدیقی کے ہاں اگرچہ طنزیہ انداز غالب ہے اور ان کے مزاح کی اساس ایک حد تک لفظی الٹ پھیر پر بھی قائم ہے۔ تاہم ان کے مضامین میں کہیں کہیں انشائیہ کے تیور ضرور مل جاتے ہیں پھر بھی ہم انہیں 'انشائیہ نویس' تو یقیناً نہیں کہہ سکتے۔ کرشن چندر کی کتاب 'ہوائی قلعے' کے بعض مضامین انشائیہ سے قریب ہیں لیکن شاید یہ زمانہ ہی طنز و احتساب کا زمانہ تھا کہ کرشن چندر نے خود کو اپنی ذات کی بجائے خارجی ناہمواریوں کی طرف متوجہ کیا اور اسی لیے انشائیہ تخلیق نہیں کر پائے۔ ان کے مقابلے میں فلک پیما کے ہاں انکشاف ذات کا عنصر نسبتاً زیادہ ہے اور ان پر انگریزی انشائیہ کا اثر بھی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے فلک پیما کے بیشتر مضامین مختصر نوٹس Notes کی صورت اختیار کر گئے ہیں یا مکالمے کے انداز میں ڈھل گئے ہیں۔ چنانچہ ان مضامین کو بھی ہم انشائیہ نہیں کہہ سکتے۔

جدید ترین دور میں انشائیہ کی طرف سنجیدگی سے توجہ ہونے لگی ہے۔ ڈاکٹر داؤد رہبر کی بعض تحریروں بالخصوص 'لمحے' اور 'چمن آرائی' کو ہم انشائیہ کا نام دے سکتے ہیں دوسرے مضامین میں ڈاکٹر صاحب نے غواصی کی بجائے بیان اور مشاہدے پر نسبتاً زیادہ توجہ صرف کی ہے۔ پچھلے دنوں مشکور حسین یاد نے انشائیہ لکھنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن دو تین ہی مضامین کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔ ان مضامین میں مشکور حسین یاد نے انشائیہ کے بنیادی محاسن کو پیش نظر ضرور رکھا تھا۔ لیکن وہ اپنے خیالات کے اظہار میں ضرورت سے زیادہ سنجیدہ تھے۔ دوسرے ان کے ہاں کہیں کہیں اصلاحی رنگ بھی آ گیا تھا۔ یہ دونوں باتیں انشائیہ کے لیے مضر ہیں۔

تو یہ ہے اردو زبان میں انشائیہ کی مختصر سی داستان۔ دراصل انشائیہ کا پورے طور سے تجزیہ کیے بغیر ہر قسم کی مزاحیہ یا نیم مزاحیہ تخلیق کو انشائیہ کا نام دے کر پیش کرنے کی جو روش ہمارے یہاں قائم ہوئی ہے، انشائیہ کے فروغ وارتقا کے لیے مضر ہے۔ پس

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم پہلے سنجیدگی سے انشائیہ کا مطالعہ کریں، اس کی حدود کا تعین کریں اور پھر اس میزان پر ہر اس ادبی تخلیق کو تولنے کی کوشش کریں۔ جسے بطور انشائیہ پیش کیا جائے۔ میری دانست میں انشائیہ کو فروغ دینے کا یہی ایک احسن طریق ہے۔

(ماخوذ: انشائیہ کے خدوخال، وزیر آغاز، لاہور، ۱۹۹۰ء)

OOOO

ڈاکٹر انور سدید

انشائیہ کا فن

فنی اعتبار سے انشائیہ موضوعی اور داخلی صنف اظہار ہے۔ انشائیہ اشیاء اور مظاہر کی خارجی سطح کو مس کرنے کے بجائے ان کے بطون کو کھنگالتا اور جذبے کو برانگیختہ کرنے کے بجائے اس کی تہذیب کرتا ہے اور یوں ہمارے سامنے مظاہر کی نئی نئی صورتیں اور تاثر کی نئی نئی کیفیتیں اجاگر کر دیتا ہے۔ انشائیہ انقباض فکر کے بجائے شگفتن ذات کا مظہر ہے اور منفی ردعمل کو ابھارنے کے بجائے مثبت جذبوں کی افزائش کرتا ہے، انشائیہ میں مصنف کی ذات کا عمل دخل چونکہ زیادہ ہوتا ہے اس لیے اس صنف میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ انشائیہ نگار نے موضوع کو کس حد تک اپنی ذات میں ضم کیا ہے، اس صنف میں ادیب کے شخصی اور کسی حد تک نجی تجربے کا کوئی نہ کوئی گوشہ ضرور منعکس ہوتا ہے، اس لیے انشائیہ اور انشائیہ نگار کے درمیان جو رشتہ موجود ہے وہ کاروباری نوعیت کا نہیں بلکہ باپ اور بیٹے کے رشتے کے مماثل ہے اور اس کا قاری وہ دوست ہے جو باپ کی محفل میں شریک ہوتا ہے تو بیٹے پر بھی محبت کی نظر ڈالتا ہے۔ بادی النظر میں 'پرسنل ایسّے' کی اصطلاح بھی اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ اس صنف کا خالق تخلیق کو اپنی ذات کے حوالے سے پیش کرتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے لکھا ہے کہ:

> ''انشائیہ میں جو بات کی جاتی ہے اپنی ذات کے حوالے سے کی جاتی ہے یا کم از کم اپنی ذات کو اس میں دخیل ضرور کیا جاتا ہے۔'' (اردو کا بہترین انشائی ادب، ص ۲۲:)

تاہم یہ وضاحت ضروری ہے کہ انشائیہ نگار کا مقصد نمائش ذات نہیں ہوتا۔ مونتین نے جب اعلان کیا تھا کہ ''اپنی کتاب کا موضوع میں خود ہوں'' تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ خود مرکزیت کا شکار یا نفرت انگیز نرگسیت میں گرفتار تھا (رشید امجد نے خیال ظاہر کیا ہے: ''انشائیہ اظہار ذات کی ایک صورت ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر انکشاف ذات کا ایک ایسا عمل ہے جس میں روحانیت کا ذائقہ بھی ہے اور مادیت کی مٹھاس بھی۔'' ماہنامہ اردو زبان، سرگودھا، نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء، ص ۳۷:) اور وہ انشائیہ کے وسیلے سے اپنی ذات کے کوائف مرتب کرنے کا آرزومند تھا۔ بلکہ وہ تو اس حقیقت کو آشکار کرنا چاہتا تھا کہ مختلف اشیاء اور مظاہر اپنی داخلی بوقلمونی سے اس کی ذات پر کس نوع کے اثرات مرتب کرتے ہیں اور اس کی ذات ان اشیاء اور مظاہر کے مخفی مفاہیم کو اپنے اوپر وارد کرتی ہے تو کیسی کیسی نئی کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ انشائیہ کا موضوع مصنف کی 'میں' نہیں ہوتا اور وہ صیغہ واحد متکلم میں آزادانہ گفتگو کرنے کے باوجود اپنی انائے کاذب کی تسکین نہیں کرتا۔ انشائیہ نگار تو تراشیدہ ہیرے سے رنگا رنگ عکس اجاگر کرتا ہے اور قاری کو روشنیوں، سایوں اور رنگوں کے اس نئے کیمیائی امتزاج سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ فراہم کرتا ہے۔ انشائیہ میں مرکزیت مصنف کی زندگی کے کوائف کو حاصل ہوتی تو انشائیہ آپ بیتی یا خودنوشت قسم کی چیز بن جاتا اور اس کی ترقی کا گراف آگے بڑھنے کے بجائے مونتین پر ہی رک جاتا۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے

کہ واحد متکلم کے استعمال فراواں کے باوجود انشائیہ میں شخصیت کی نمود مقصود بالذات نہیں بلکہ محض ایک وسیلہ ہوتی ہے۔ موضوع کتنا ہی غیر اہم کیوں نہ ہو جب یہ انشائیہ نگار کی شخصیت کے گداز لمس سے آشنا ہوتا ہے تو خود بخود انشائیہ میں ڈھل جاتا ہے۔ چنانچہ انشائیہ کے باطن سے کسی ادیب کی شخصیت کی دلنواز جھلکیاں تو دیکھی جا سکتی ہیں لیکن اس سے ادیب کی سوانح عمری مرتب نہیں ہو سکتی۔ خالد اقبال نے لکھا ہے کہ ''انشائیہ آزاد ترنگ کی پیداوار ہے۔ اس میں ذات کے حوالے بھی آزاد لہروں اور موجوں کی شکل میں مرتعش ہوئے ہیں۔'' (انشائیے میں حوالۂ ذات، امروز لاہور، ادبی ایڈیشن)۔ اور اسی لیے کہا جاتا ہے کہ کسی مصنف کے اندر جھانکنے کے لیے انشائیہ سے بہتر کوئی کھڑکی نہیں۔ شمیم حیدر ترمذی نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ''انشائیہ کے مواد اور ہیئت میں انشائیہ نگار کی روح جلوہ گر ہوتی ہے اس نثر لطیف میں مصنف کی ذات سارے رنگوں کے ساتھ منعکس ہوتی ہے۔'' (رسالہ آہنگ، کراچی، ۱۶/اپریل ۱۹۸۳ء، ص ۱۳:)

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ موضوع انشائیہ نگار کی ذات کو مس کیونکر کرتا ہے؟ اور جب یہ مس کرتا ہے تو اس سے انکشاف ذات کیسے ہوتا ہے؟ یہ سوال بنیادی طور پر ادیب اور شخصیت کے اہم مسئلے کو منظر پر ابھارتا ہے۔ ہر فن پارے میں اس کے خالق کا پرتو کسی نہ کسی صورت میں موجود ہوتا ہے۔ تاہم یہ بات بھی ملحوظِ نظر رہے کہ ادب کی دوسری اصناف میں شخصیت کا اظہار بالواسطہ ہے، بیشتر ادبا نے تو ادب کو شخصیت کی نفی قرار دیا ہے۔ بعض ادبا نے اسے شخصیت کا پردہ سمجھ کر قبول کیا ہے۔ افسانہ اور ناول میں ادیب اپنے کینوس کی حدود میں پابند ہے۔ شاعری میں ردیف، قافیہ، وزن اور بحر وغیرہ کی موجودگی شاعر پر ایسی پابندیاں عائد کر دیتی ہے جس سے اس کے تخلیقی ابال کے اظہار میں جگہ جگہ رکاوٹیں سی پیدا ہو جاتی ہیں، بعض اوقات مصرعوں کی تعداد اور ارکان کی کمی بیشی بھی شاعر کے مستقیم اظہار میں رکاوٹ پیدا کر دیتی ہے اور وہ پوری تخلیقی سرگرمی کا مظاہرہ کرنے سے قاصر رہتا ہے اور فن پارے میں اس کی تخلیقی شخصیت کا پورا انعکاس نہیں ہو پاتا۔ اس کے برعکس انشائیہ ایک ایسی صنف ادب ہے جو کسی واسطے سے بھی پردے کو قبول نہیں کرتی، یہ تمام رسمی پابندیوں سے آزاد ہے اور اکثر اوقات موضوع کے حوالے سے ادیب کی شخصیت کے کچھ ایسے گوشوں کو بھی آشکار کرتی ہے جنھیں رسمی انداز میں اہل جہاں کے سامنے پیش کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل چند اقتباسات ملاحظہ ہوں جن میں انشائیہ نگاروں نے شخصیت کے بعض ایسے گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے جنھیں کوئی عنوان نہیں دیا جا سکتا:

> ''میں نہ صرف بھورے رنگ کے کاغذ کو پسند کرتا ہوں بلکہ کاغذ میں بھورے پن کے وصف کا مداح ہوں، بعینہٖ جیسے مجھے اکتوبر کے جنگل میں، جو کی شراب میں یا شمالی علاقے کی ندیوں میں بھورے رنگ کا وصف اچھا لگتا ہے۔ بھورا کاغذ تخلیق کی پہلی ضرب سے پھوٹنے والی ابتدائی شفقی روشنی کا مظہر ہے اور ایک یا دو تیز رنگ کے چاکوں سے آپ اس میں آپ کی اس تمازت کو بھی نمایاں کر سکتے ہیں جس میں سونے ایسی چنگاریاں لہو کی طرح سرخ اور سمندر کی طرح سبز ہوتی ہیں، جیسے ان کی حیثیت ان تند ستاروں کی سی ہو جو روز ازل تاریکی سے لپک کر باہر آ گئے تھے۔'' (جی کے چسٹرٹن، چاک کا ٹکڑا) (اوراق، افسانہ و انشائیہ نمبر، مارچ اپریل ۱۹۷۲ء، ص ۲۵۹: ترجمہ وقار النساء آغا)

> ''میرے خیال میں غلطیوں کی سب سے بڑی شان یہ ہے کہ ان سے پڑھنے والوں میں احساس برتری پیدا ہو جاتا ہے اور وہ کسی نہ کسی بہانے اپنے آپ کو ادیب و شاعر سے بڑا اور پر از معلومات محسوس کرتے ہیں۔ مشہور ادیب ڈاکٹر جانسن نے جب اپنی ڈکشنری میں ایک غلطی کر دی اور ایک عام عورت نے ڈرتے ڈرتے جانسن

کی توجہ اس جانب مبذول کرائی تو جانسن نے بڑی فراخ دلی سے اس غلطی کو تسلیم کرلیا۔ اس وقت اس عورت کو کتنی خوشی ہوئی ہوگی، جانسن کی تحریروں میں ایسی ہی غلطیاں آج بھی نفسیانی طور پر پڑھنے والوں کو فائدہ پہنچاتی ہیں۔'' (رابرٹ لنڈ، کچھ غلطیوں کی شان میں) (اردو زبان، سرگودھا، انشائیہ نمبر، مارچ اپریل ۱۹۸۳ء، ص ۱۱: ترجمہ احمد جمال پاشا)

''مسکراہٹ اور تہذیب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مجھے سنجیدہ قوم سے بڑا ڈر لگتا ہے کیونکہ یہ پلک جھپکنے میں ہٹلر اور قیصر ایسے جانباز پیدا کرلیتی ہے اور ہنستی ہوئی قوم سے مجھے نفرت ہے کہ یہ نرگسیت کے برملا اظہار کا ایک نہایت قبیح نمونہ ہے اور اس میں خوجی اور ڈان کہوٹے ایسے عاشق زار آناً فاناً پیدا ہوجاتے ہیں۔ مگر ایک مسکراتی ہوئی قوم ضبطِ نفس، تہذیبی نکھار جاننے اور پہچاننے کے مراحل سے شناسائی کا ایک کھلا ثبوت ہے، مسکراہٹ اپنی ملائمت اور نرمی کے باعث دلکش اور دلنواز تو ہے ہی تاہم اس میں اگر خدانخواستہ زہرنا کی شامل ہوجائے تو بھی یہ فریق مخالف کو ہنسی کی طرح ذلیل نہیں کرتی بلکہ اسے محض ذرا سا کچوکا لگا کر اور یوں اسے دوبارہ باادب باملاحظہ ہوشیار رہنے کی تلقین کرکے خاموش ہوجاتی ہے۔ کیسی عمدہ بات ہے۔'' (وزیر آغا، کچھ مسکراہٹ کے بارے میں) (دوسرا کنارہ، ص ۷۶: سرگودھا، ۱۹۸۲ء)

''چھڑی کی معیت میں مجھے اپنی غیر متوازی حالت سے چھٹکارا ملا ہے اور یوں محسوس ہوا ہے جیسے میں کسی آشرم میں پہنچ گیا ہوں، یا میرا جہاز کسی چھوٹی سی بندرگاہ پر لنگر انداز ہونے کے بعد خراب ہوگیا ہے یہی نہیں بلکہ چھڑی ہاتھ میں لیتے ہی مجھے اپنے اندر ایک عجیب سے جذبۂ افتخار کی کلبلاہٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔ میں اپنے آپ کو سب سے الگ تھلگ اور جدا ایک اونچے سنگھاسن پر کھڑا پاتا ہوں اور کوئی شے مجھے ایک زوردار تقریر کرنے پر اکساتی ہے۔ (مشتاق قمر، چھڑی) (ہم ہیں مشتاق، ص ۱۵: سرگودھا، ۱۹۷۰ء)

''نیم پلیٹ پڑھنا میری محبوب ترین ہابی ہے۔ یہ بات جب میں نے ایک انٹرویو میں صاحب صدر سے کہی تو وہ ایک طنز آمیز ہنسی پر لب دہن لا کر بولے: ''بھئی یہ تو کوئی ہابی نہیں...'' ان کا خیال تھا کہ نیم پلیٹ پڑھنے کا شغل ایک غیر دانشمندانہ اور احمقانہ فعل ہے۔ مگر میرا آج بھی یہ خیال ہے کہ اس سے بڑھ کر دلچسپ، فکر انگیز اور مفید شغل اور کوئی نہیں کہ بغیر افراد کو ملے ہم ان کی شخصیت سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں، ان کے شعور اور تحت الشعور میں تیرا کی کرسکتے ہیں اور ان کے حمام میں جھانک سکتے ہیں۔'' (جمیل آذر، نیم پلیٹ) (شاخ زیتون، ص ۵۵: سرگودھا، ۱۹۸۱ء)

مندرجہ بالا مثالوں میں انشائیہ نگاروں نے اشیاء اور مظاہر کے بعض غیر رسمی گوشوں کو اپنی شخصیت کے حوالے سے اجاگر کرنے اور ایک نیا مدار حقیقت دریافت کرنے کی کاوش کی ہے۔ تاہم یہ سوال شاید ابھی تک لاینحل ہے کہ موضوع انشائیہ نگار کی ذات کو کس طرح مس کرتا ہے۔ اردو ادب میں تاحال کسی ادیب نے 'میں انشائیہ کیونکر لکھتا ہوں' قسم کا جواب مضمون تحریر نہیں کیا۔ تاہم اے سی بینسن نے یہ حقیقت آشکار کی ہے کہ انشائیہ میں موضوع اہم نہیں ہوتا۔ (اے سی بینسن، آرٹ آف وی ایسے اسٹ، ص ۱۴: لندن، ۱۹۵۴ء)

انشائیہ توکسی بھی موضوع پر بھی لکھا جاسکتا ہے۔اہم چیز تومصنف کی ذات ہوتی ہے۔احمد ندیم قاسمی نے لکھا ہے کہ ''انشائیے کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی، اپنی ذات کے بارے میں لکھئے۔کائنات کے بارے میں لکھئے۔ کسی ایک نقطے پر زور دیجئے یا بہت سے نقاط کو مربوط کر دیجئے۔آپ جو چاہیں کیجئے یعنی اپنے خیالوں، جذبوں، تجربوں اور مشاہدوں کے ساتھ کھل کھیلئے۔'' (ممکنات انشائیہ،فلیسپ)

رشید امجد نے لکھا ہے کہ:

> ''انشائیہ کی ساری بحث شخصیت کی نفاست وشرافت کی بحث ہے۔ اچھے انشائیہ کے لیے بڑی شخصیت یا یوں کہہ لیجئے کہ شخصیت کی نفاست اور شرافت کا ایک خاص معیار ہونا ضروری ہے۔ ورنہ موضوع جو بھی ہو، اسلوب جیسا بھی ہو، انشائیہ میں فلسفیانہ عظمت، روحانی شگفتگی اور ارفع مسرت پیدا نہ ہو سکے گی۔ ایک کھردری شخصیت اچھا انشائیہ لکھ ہی نہیں سکتی۔'' (رشید امجد، کچھ انشائیہ کے بارے میں، اردو زبان، نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء)

چنانچہ انشائیہ میں دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ انشائیہ نگار کی ذات جب موضوع کو مس کرتی ہے تو کس طرح کھلتی ہے۔ شگفتن ذات کا یہ عمل پھول کھلنے کے عمل سے مشابہ ہے جس طرح پھول کے داخل سے ابھرنے والی خوشبو پنکھڑیوں کو نامعلوم طور پر نکھار دیتی ہے اسی طرح انشائیہ نگار کی ذات موضوع کے لمس سے اپنی ذات کی گرہیں کھولتی اور خود کو قاری پر منکشف کرتی چلی جاتی ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا نے اس عمل کی طرف بامعنی راہنمائی کی ہے اور لکھا ہے کہ:

> ''انشائیہ نگاری کا مخصوص رویہ... زندگی سے بیک وقت مربوط ہونے اور اس سے منقطع ہونے کی دوگونہ کیفیات سے عبارت ہوتا ہے۔یعنی سمندر کے لمس کو محسوس کرنے مگر سمندر کے سارے خروش کو ایک متبسم نگاہ سے دیکھنے کا رویہ... میں اب اسی مقام پر ہوں جہاں سے میں زندگی کو پہلی بار ایک ایسے تناظر میں دیکھ رہا ہوں کہ مجھے کائنات کے بڑے بڑے مظاہر کے علاوہ اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور چیزوں میں بھی ایک جہان معنی نظر آنے لگا ہے۔ مثلاً پرسوں کی بات ہے کہ کتابوں کا ایک پیکٹ بنانے کے لیے مجھے رسی کی ضرورت پڑی مگر جب رسی ملی تو اس میں ایک مضبوط سی گرہ پڑی ہوئی تھی۔ میں کتنا ہی عرصہ اپنے ناخنوں کی مدد سے اسے کھولنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب کامیاب نہ ہوا تو اپنے دانتوں سے مدد طلب کی۔ کتنا ہی عرصہ دانتوں نے پیچھے ہٹ ہٹ کر گرہ پر حملے کیے تب کہیں جا کر گرہ کھلی، میں نے دیکھا کہ جہاں گرہ تھی وہاں رسی میں ایک سلوٹ سی پڑ گئی تھی، میں نے رسی کو ذرا سا کھینچا، سلوٹ کو چند سے سہلایا اور گرہ رسی کے اندر پوری طرح جذب ہوگئی۔اچانک میں رک گیا اور سوچنے لگا کہ گرہ کہاں گئی؟ اور تب ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میرے ذہن میں آیا کہ میں خود بھی تو زندگی کی دوڑ میں محض ایک گرہ ہوں اور میری طرح ہر شخص ایک گرہ ہے۔جب گرہ کھل جاتی ہے تو وہ زندگی کی ڈور میں جذب ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصہ کے لیے ایک سلوٹ ہیں مگر سلوٹ سی ضرور باقی رہتی ہے جس پر لوگ ازراہ محبت پھول بھی بچھاتے ہیں مگر پھر آہستہ آہستہ وہ بھی غائب ہو جاتی ہے۔تب میں نے اپنے چاروں طرف ایک نظر دوڑائی۔ساری خلق خدا، سیاہ، سفید، پتلی، موٹی، کسی ہوئی یا ڈھیلی ڈھالی گرہوں کی صورت میں بکھری پڑی تھی اور زندگی اور موت کا ڈرامہ یکا یک مجھے ایک اور ہی روشنی میں دکھائی دینے

لگا تھا۔"(وزیر آغا، دوسرا کنارہ، ص ۱۰:۔۱۱، سرگودھا، ۱۹۸۲ء)

آپ نے دیکھا کہ رسی کی ایک چھوٹی سی گرہ نے کس طرح انشائیہ نگار کی توجہ اپنی طرف کھینچی اور پھر کس طرح پوری زندگی ایک ڈور کی طرح نظر آنے لگی اور اس کی اپنی ذات بھی محض ایک گرہ بن گئی جو سلجھ جائے تو زندگی اسے کلی طور پر جذب کر لے اور نہ سلجھے تو اس کی انفرادیت کی مظہر بن جائے اور دل یزداں میں کانٹا بننے سے بھی گریز نہ کرے۔ اسی سے انشائیہ نگار نے زندگی اور کائنات کے درمیان ربط باہم تلاش کیا، موت اور حیات کے فلسفے کی طرف پیش قدمی کی اور پھر زندگی کا ڈرامہ روشنیوں اور سایوں کا نیا منظر پیش کرنے لگا۔ انشائیہ نگار نے ایک چھوٹی سی بات کو نئی حقیقت میں تبدیل کر دیا بلکہ اسے شگفتہ بیانی سے پیش کیا اور اس پر اپنی ذات کا مثبت تاثر بھی یوں منقش کر دیا کہ اب اس سے ایک نئی روشنی چھن چھن کر اطراف و جوانب میں بکھرنے لگی اور گرہ کھولنے کے ناخوش گوار عمل نے بھی ہمارے ذہن میں ایک نئی کھڑکی کھول دی جس سے زندگی کی نئی معنویت بلا روک ٹوک ہماری جانب سفر کرتی نظر آتی ہے۔ چنانچہ رشید امجد نے انشائیہ کے سفر کو خلوص کے تقدس اور فن میں ڈوب کر زندگی کی نئی معنویت پانے کا سفر قرار دیا ہے۔(رشید امجد، کچھ انشائیہ کے بارے میں، اردو زبان سرگودھا، نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء، ص ۷۳:)

انشائیہ میں انکشاف ذات کا عمل فنکار کو اپنی 'ایغو' کے اظہار اور ذات کی نمائش کے بے جا مواقع بھی فراہم کر سکتا ہے۔ مغرب میں انشائیہ کے بانی مانتین کے بارے میں تو مشہور ہے کہ وہ بے حد انا پسند تھا اور جب اہل جہاں سے اکتا گیا تو اس نے اپنے گاؤں کے ایک کونے میں پناہ حاصل کر لی لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ گاؤں کی اس معطر تنہائی میں جب اس کی ملاقات اپنے اندر کے انشائیہ نگار سے ہوئی اور اس نے مانتین کو بے نقاب کرنا شروع کر دیا تو اس عمل میں ایک ایسی شخصیت ابھر کر سامنے آئی جس کی پرورش تہذیب کے اعلیٰ گہوارے میں ہوئی تھی اور جس میں نخوت، تکبر اور خود پسندی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ جے بی پریسٹلے نے لکھا ہے کہ "اگر انشائیہ نگار انا پسند نہیں ہے تو وہ کچھ بھی نہیں ہے۔" (J. B. Priestley: "Essay ??????? and Present, Page: 10) وجہ یہ کہ انا پسند دنیا کے ہجوم میں اپنی شخصیت کو گم نہیں ہونے دیتا۔ وہ دنیا کو انبوہ کی نظر سے دیکھنے کے بجائے اپنی ذاتی آنکھ سے اور اکثر اوقات تیسری آنکھ سے دیکھتا ہے اور ان گوشوں تک رسائی حاصل کرتا ہے جنھیں ایک عام انسان ہجوم افکار میں دیکھ ہی نہیں سکتا۔ انشائیہ نگار انہیں منفرد گوشوں کو قاری کے سامنے آشکار کرتا ہے لیکن اس عمل میں اس کی 'ایغو' کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے اور وہ زندگی، کائنات اور معاشرے کے سامنے ایک منکسر، مخلص اور عبادت گزار انسان کی صورت میں ہی آتا ہے اور قاری کو مرعوب کرنے یا احساس کمتری میں مبتلا کرنے کے بجائے اسے اپنا دوست بنا لیتا ہے۔ چنانچہ مانتین کے انشائیے محض اس کی تحریریں ہی نہیں بلکہ مانتین کی ذات کا عکس بھی ہیں۔ لیمب کے انشائیے صرف اشیاء اور مظاہر کے بارے میں اس کے ذاتی بیانات ہی نہیں بلکہ اس میں چارلس لیمب کی شخصیت کا جوہر بھی موجود ہے۔ غلام جیلانی اصغر اپنے انشائیوں میں ایک بڑے تعلیمی ادارے کے سربراہ، وزیر آغا ایک طویل و عریض خطۂ اراضی کے کاشتکار اور جمیل آذر علم و دانش کے بوجھ تلے لدے ہوئے بھاری بھرکم پروفیسر نظر نہیں آتے بلکہ زندگی کے ایسے خوش فکر ناظر دکھائی دیتے ہیں جو اپنے من کی موج کا ساتھ دے کر ہر قسم کے اعتراضات کرنے اور اپنی ذات کو بے نقاب کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انشائیہ کے فن کی جزئیات میں انکشاف ذات کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اور اس کے بغیر اچھا انشائیہ تخلیق نہیں ہو سکتا۔

اسلوب:

اسلوب شخصیت کا ہی عکس ہوتا ہے اور یہ اپنا جلوہ ہر تحریر میں دکھاتا ہے تاہم انشائیہ میں اس کی اہمیت دوسری اصناف ادب سے نسبتاً زیادہ ہے۔ موضوع کوئی بھی ہو جب تک اسے اسلوب کی تازگی شگفتگی اور بہجت آفروزی صحت مند انداز میں سہارا نہیں دیتی قاری اس کی طرف محبت سے دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔ ایف ایل لوکس نے لکھا ہے کہ:

> ''اسلوب وہ طریق کار ہے جس سے فنکار دوسروں کو متاثر کرتا ہے، اسلوب کا مسئلہ دراصل شخصیت کا مسئلہ ہے۔'' (ایف ایل لوکس، بحوالہ سید عابد علی عابد، اسلوب، ص ۵۸: ، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۱ء)

انشائیہ میں ادیب کی شخصیت چونکہ باندازِ دگر شامل ہوتی ہے اس لیے یہ کہنا درست ہے کہ انشائیہ میں اسلوب شخصیت کے بعض نامعلوم منطقوں تک رسائی حاصل کرنے میں معاونت کرتا ہے، اور یہی وہ سحر جمال ہے جس سے انشائیہ نگار قارئین کے وسیع طبقے کو اپنے دام خیال میں لپیٹ لیتا ہے۔

اسلوب، ہیئت اور خیال کے باہمی اشتراک سے ترتیب پاتا ہے، یہی دو چیزیں ادب کا ظاہر اور باطن ہیں، لفظ ان دونوں کے اشتراک باہم کا وسیلہ ہے۔ لفظ کا درست اور برمحل استعمال خیال میں قوت پیدا کرتا ہے، اس کی گہرائی میں اضافہ کرتا ہے، معنویت بڑھاتا ہے اور بالآخر ان سب کی امتزاجی صورت سے اس اسلوب کو جنم دیتا ہے جو ہر تخلیق کار کا اپنا اور یکسر جداگانہ ہوتا ہے اور جس سے اس کی تخلیقی اور تہذیبی شخصیت کے گوشے آشکار ہوتے ہیں۔ لفظ وہ جسم ہے جسے خیال کی روح تحرک اور تازگی بخشتی ہے۔ فنکار کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی غواصی کے عمل سے الفاظ کی مرمریں مورتیوں میں زندگی کی لہر اس طرح دوڑائے کہ لفظوں کا اعجاز گویائی حاصل ہوجائے اور وہ قاری سے اس طرح باتیں کرنے لگیں جس طرح فنکار تخلیقی لمحے میں خود اپنے آپ سے ہم کلام ہوتا ہے۔ انشائیہ میں چونکہ تخاطب کے بجائے خود کلامی کا زاویہ نمایاں ہے اور انشائیہ نگار کائنات میں بکھرے ہوئے عناصر اور ان کے بارے میں اپنے ذاتی تاثر کو ایک نئے آہنگ اور ایک نئی تنظیم سے پیش کرتا ہے اس لیے اسلوب اس قسم کے فن پارے میں زیادہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ''انشائیہ میں کہا گیا ہے؟ کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن اس سے بھی ضروری امر یہ ہے کہ کیسے کہا گیا ہے؟'' وجہ یہ کہ انشائیہ بھاری بھرکم دلائل و براہین اور بوجھل استدلال کا متحمل نہیں ہوتا بلکہ اکثر اوقات تو انشائیہ غیر اہم اشیا اور مظاہر کو بھی اہم ترحیثیت دے دیتا ہے۔ اس قسم کے موضوعات میں انشائیہ نگار کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ موضوع کے نئے زاویے نکھارے تو انہیں اسلوب کی تازہ کاری سے ہی پیش کرے تاکہ انشائیہ نگار نے ایک عام موضوع کو مضمون عالی کی حیثیت دی ہے تو یہ ابلاغ کامل کو ہی سر نہ کرے بلکہ معنی و صورت کے ربط باہم سے قاری کو اپنے جادوئی اثر میں بھی محیط کرے۔

جے بی پریسٹلے نے لکھا ہے کہ ''انشائیہ نگار کی کامیابی اس کے انداز اور اسلوب کی مرہون منت ہے۔'' (ڈاکٹر وزیر آغا، دوسرا کنارہ، ص ۸:) اور وجہ یہ بتائی ہے کہ انشائیہ نگار لکھے ہوئے لفظ سے بولے ہوئے لفظ کا کام لیتا ہے اور ہر قدم پر ہمیں اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ وہ جب ایک کیفیت سے دوسری کیفیت کی طرف پیش قدمی کرتا اور ایک حقیقت سے کسی سابقہ حقیقت کی طرف مراجعت کرتا ہے تو اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ، آنکھوں کی چمک اور دل میں پیدا ہونے والی جذباتی صورت سب لفظوں کے پیکر میں سما جاتی ہے اور ہم ایک ناظر کی حیثیت میں نہ صرف ان سب کیفیات کا مشاہدہ کرتے ہیں بلکہ اس نئے مدار میں خود بھی سفر کرتے ہیں، چنانچہ اگر انشائیہ نگار کا اسلوب آئینے کی طرح لو نہیں دیتا تو اس کی بنائی ہوئی تصویریں دھندلی پڑ جائیں گی، قاری پر اپنی جزئیات کا پورا انعکاس کرنے سے قاصر رہیں گی اور انسانی فطرت کے وہ نیم تاریک گوشے جنھیں دائرۂ نور میں لانے کی کاوش کی گئی تھی پوری طرح سامنے نہیں آسکیں گے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ سے بنیادی نوعیت کا یہ تقاضا کیا ہے کہ:

> ''انشائیہ شے یا مظہر کے چھپے ہوئے ایک نئے معنی کو سطح پر

لائے۔" (ڈاکٹر سید محمد حسین، صنف انشائیہ اور انشائیے، ص ۳۷:)

لیکن اہم بات یہ ہے کہ اس تقاضے کے ساتھ انشاء کی تازہ کاری اور زبان کے تخلیقی استعمال کی شرط بھی عائد کی گئی ہے۔ ڈاکٹر محمد حسین نے لکھا ہے کہ:

"(تحریریں) انشاء نہ ہو تو تحریر لکیر بن جاتی ہے اور عبارت مجہول النسب ہو جاتی ہے۔ انشائیہ اور انشاء میں وہی تعلق ہے جو کرۂ ارض اور آفتاب میں ہے۔ یعنی اس کی شعاعیں روشنی دیتی ہیں اور حرارت بھی۔" (ڈاکٹر سید محمد حسین، صنف انشائیہ اور انشائیے، ص ۳۷:)

سید احتشام حسین کا ارشاد ہے کہ:

"ایسے (انشائیہ) کو تو ایک ایسی فلسفیانہ شگفتگی کا حامل ہونا چاہیے جو پڑھنے والے کے ذہن پر منطق اور استدلال کے ذریعے نہیں بلکہ محض خوشگوار استعجاب اور بے ترتیب مفکرانہ انداز بیان کے ذریعہ اپنا تاثر قائم کرے۔" (سید احتشام حسین، اردو انشائیہ، از صفی مرتضیٰ، پیش لفظ، ص ۷:)

چنانچہ دنیا کے معروف انشائیہ نگاروں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اس صنف ادب میں کامیابی نے صرف انہیں انشائیہ نگاروں کے قدم چومے جو اپنا منفرد، تخلیقی اور تازگی سے معمور اسلوب تخلیق کرنے میں کامیاب ہو گئے اور یہ اسلوب ان کی تحریر کا آئینہ ہی نہیں تھا بلکہ اس کے عقب سے اس تہذیب و تمدن کی جھلکیاں بھی نظر آتی تھیں جس میں ان انشائیہ نگاروں نے زندگی بسر کی تھی اور جوان کے گردوپیش میں پھیلی ہوئی تھی۔ چنانچہ مانتین کے اسلوب میں داخلیت کا عنصر زیادہ ہے۔ وہ زندگی پر سیر حاصل اور طمانیت سے بھرپور نظر ڈالتا ہے اور قاری کو حقیقت کی نئی نہج سے آشنا کر دیتا ہے۔ ابراہم کاؤلے کی سادگی میں پرکاری نظر آتی ہے اور وہ معمولی جملوں سے بڑے بڑے نتائج کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ بیکن کے اسلوب پر زندگی کا فلسفہ غالب ہے اور وہ عقل و شعور کے وسیع مدار کو بڑی خوش اسلوبی سے چند لفظوں میں سمیٹ ڈالتا ہے۔ ہیزلٹ کے اسلوب پر معنوی کیفیت طاری ہے اور وہ اپنی خلوت سے دنیا پر ایک سیاح کی نظر ڈالتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ چسٹرٹن کے اسلوب میں لفظ چہچہانے لگتے ہیں اور قاری ان کے باطن میں موجود شوخ دنیا کی جھلک بھی دیکھ لیتا ہے۔ اردو انشائیہ نگاروں میں سے وزیر آغا نے لفظ کو ادراک حقیقت کا وسیلہ بنایا ہے، ان کے اسلوب میں نکتہ آفرینی کا عنصر نمایاں ہے۔ مشتاق قمر کا اسلوب اس کے ذوق سلیم کا آئینہ دار ہے اور وہ خیال کے ہنڈولے اس طرح جھلاتا ہے کہ اس کی ہر لہر کے ساتھ ایک نئی کیفیت اجاگر ہوتی چلی جاتی ہے۔ غلام جیلانی اصغر کے اسلوب میں مزاح کی ایک شوخ کرن ہر قدم پر سر ابھارتی ہے اور افق حیات کو پھلجھڑی کی طرح جگمگا دیتی ہے۔ جمیل آذر نے لفظ و معنی کے امتزاج سے بلاغت پیدا کی ہے۔ احمد جمال پاشا کا اسلوب ایک مثبت ذہن کی نشاندہی کرتا ہے۔ کامل القادری نے استعارے کو حقیقت کے مدار میں گردش کرنے کا موقعہ دیا ہے۔ شمیم ترمذی کا اسلوب حواس خمسہ کا امتزاجی مظہر ہے اور وہ رنگوں کو بکھیرنے کے بجائے انہیں سمیٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نظیر صدیقی کے اسلوب میں ان کی سنجیدگی پر غیر سنجیدگی شعوری غلبہ پاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ سلیم آغا قزلباش نے ایک ایسا اسلوب وضع کیا ہے جو خیال کے ایک ہی آئینے سے متعدد نئی تصویریں دکھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مشکور حسین یاد کے اسلوب میں بعض جانوروں کی آوازیں ابھرتی سنائی دیتی ہیں اور وہ لفظ کی مضحک صورت ابھارنے میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ نئے انشائیہ نگاروں میں سے جان کاشمیری کے اسلوب میں حلاوت، اکبر حمیدی کے اسلوب میں صباحت اور محمد اسد اللہ کے اسلوب میں حقیقت کا نقاب الٹنے کا انداز نمایاں ہے۔ اکبر حمیدی کا اسلوب لفظ کا دوسرا زاویہ ابھارنے کی استعداد رکھتا ہے۔ محمد اقبال انجم اور محمد یونس بٹ حقیقت کی نئی پرت کو اپنے اسلوب کے بل بوتے پر اجاگر کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا انفرادی اوصاف کے علاوہ یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ بیشتر

انشائیہ نگاروں نے اپنی نثر کی کشتی کو بند پانیوں میں تیرنے کی اجازت نہیں دی بلکہ جب وہ نئے براعظموں کی سیاحت پر نکلتے ہیں تو کھلے پانیوں میں سفر کرتے ہیں۔ اس تخلیقی سفر میں انھوں نے جو شگفتہ نگاری کی ہے اس میں مزاح اور طنز سے بھی بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اس عمل سے بلاشبہ انشائیہ کے اسلوب میں کشادگی، پھیلاؤ اور روانی پیدا ہوئی ہے لیکن نقصان یہ ہوا کہ اسلوب کی شگفتگی کو طنز و مزاح کا مترادف تصور کرلیا گیا۔ چنانچہ انشائیہ اور طنز و مزاح کی حدود کو آپس میں گڈمڈ ہونے کا موقعہ مل گیا۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مزاح دراصل ایک مضحک فعل اور طنز غیر معمولی سنجیدہ عمل ہے۔ انشائیہ ان دونوں عوامل سے فائدہ تو اٹھاتا ہے لیکن انہیں اپنے اصل مزاج پر غالب نہیں آنے دیتا۔ انشائیہ کا مزاج غیر رسمی ہے اور یہ سنجیدگی اور تضحیک دونوں کی تلافی کر ڈالتا ہے۔ شخصیت کے حوالے سے بات کی جائے تو طنز ارفع شخصیت کا، مزاح انفعالی شخصیت کا اور انشائیہ متوازن شخصیت کا مظہر ہے۔ طنز میں ادیب ایک مصلح کا روپ اختیار کرلیتا ہے اور فراز پر کھڑے ہو کر نشیب کی ہر چیز پر استہزائی نظر ڈالتا ہے۔ (ڈاکٹر وزیر آغا، اردو ادب میں طنز و مزاح، اکادمی پنجاب، لاہور)

مزاح میں ادیب استہزا اور ہیئت کذائی کا نشانہ خود بنتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ نشیب میں گر کر ناظر کے جذبۂ ترحم کو بیدار کرنے کی سعی کرتا ہے اور وہ بھی اس انداز میں کہ پہلے ناظر کے لبوں پر قہقہہ بیدار ہوتا ہے اور پھر دل کی کسی اندرونی گہرائی میں رحم کا جذبہ۔۔۔ انشائیہ میں ادیب ایک ہموار سطح پر ناظر کے دوش بدوش کھڑا ہو کر منظر سے تحصیل مسرت کرتا ہے اور پھر اپنا تجربہ بھی رواں دواں انداز میں بیان کرتا جاتا ہے۔ مزید وضاحت کے لیے میں اس کی مثالی کیچڑ میں لتھڑے ہوئے آدمی سے دوں گا۔ صنف مزاح میں کیچڑ میں لتھڑا ہوا یہ آدمی خود مزاح نگار ہے جو پاس کھڑے ہوئے صاف ستھرے تماشائیوں کو لطف تماشا فراہم رہا ہے۔ دوسری طرف طنز میں شاہد کا کردار خود طنز نگار ادا کرتا ہے۔ یہ صاف ستھرے کپڑے پہنے فاصلے پر کھڑا ہے اور کیچڑ میں لتھڑے ہوئے آدمی کی ہیئت کذائی پر نہ صرف قہقہہ زن ہے بلکہ اپنی صاف بدنی پر تفاخر کا اظہار بھی کر رہا ہے۔ ان دونوں کے برعکس انشائیہ نگار اس انبوہ سے ہٹا ہوا شخص ہے جو فٹ پاتھ پر سے اتر کر کیچڑ میں سے گزر رہا ہے لیکن زہر خند یا ہنسی کو جنم دینے کے بجائے کیچڑ سے اکتساب سرور کر رہا ہے اور اپنے دوستوں کو ایسی شگفتہ باتیں بتا رہا ہے جو اسے مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سونگھنے، زمین کے لمس سے آشنا ہونے اور کیچڑ کا ذائقہ چکھنے سے پہلے معلوم نہیں تھیں۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ طنز و مزاح میں زندگی کے موجود زاویے پر مثبت یا منفی تبصرہ ہوتا ہے جبکہ انشائیہ موجود کی کایا کلپ کر دیتا ہے اور ناظر کو معلوم حقیقت سے ہٹا کر زندگی کی نامعلوم ڈگر پر ڈال دیتا ہے اور یہ ڈگر اتنی انوکھی ہوتی ہے کہ ہمیں اس پر چلتے ہوئے مسرت اور سرخوشی کی ایک انوکھی نہایت حاصل ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے کہ ''انشائیہ فراز یا نشیب کی نہیں ہموار سطح کی پیداوار ہے۔'' (ڈاکٹر وزیر آغا، نئے مقالات، ص ۲۳۲: سرگودھا، ۱۹۷۲ء) مراد یہ کہ فراز آپ کے احساس برتری کو ابھارتا ہے اور نشیب احساس کمتری کو لیکن ہموار سطح سے رفاقت اور دوستی کو تحریک ملتی ہے اور انشائیہ نگار کا انداز پیش کش اتنا دوستانہ ہوتا ہے کہ قاری اس کے خلوص میں شامل ہو کر طمانیت سی پالیتا ہے۔ بالفاظ دیگر انشائیہ میں طنز و مزاح کے استعمال کی بس اتنی ہی گنجائش ہے جتنی ایک دوستانہ محفل کی یک جہتی کو برقرار رکھنے اور اس کی شگفتگی اور تازہ کاری کو قائم رکھنے کے لیے قبول کی جاسکتی ہے۔ انشائیہ نمائش، تصنع، آرائش اور تکلف کی فضا کے برعکس دوستانہ اور غیر رسمی ماحول میں پروان چڑھتا ہے۔ اس عمل کو آزماتے ہوئے انشائیہ نگار اپنی ذات کی بارہ دری کے سب دروازے کھول دیتا ہے اور وہ نہ صرف صاف ستھری ہوا، منزہ چاندنی یا نکھری ہوئی اجلی دھوپ کو ہی اندر آنے کی اجازت دیتا ہے بلکہ قاری کو بھی بانہوں میں بانہیں ڈال کر اندر لے آتا ہے، اسے اپنے ساتھ کھاٹ پر بٹھا لیتا ہے اور دوئی کے تمام پردے

ہٹا کر ایک اچھے میزبان کی طرح زندگی کے ایسے موضوعات پر گفتگو کرتا ہے جن میں مہمان کے لیے تازگی، مسرت اور بہجت کے تمام عناصر موجود ہیں۔ اس تمام گفتگو میں اس کے پیش نظر صرف ایک ہی بات رہتی ہے کہ مہمان کو کوئی بات ناگوار نہ گزرے اور وہ اس کی شگفتہ باتوں سے مزید اس کے قریب آجائے۔ اس میں قبل از طعام طنز اور بعد از طعام مزاح کا زاویہ بھی مناسب حدوحساب کے ساتھ شامل ہوسکتا ہے لیکن بنیادی شرط یہ ہے کہ لہجے میں درشتی کی بجائے حلاوت، سنگینی کی بجائے نرمی اور عدم اعتدال کے بجائے توازن ہو۔ چنانچہ بیشتر نقادوں نے طنز کی سمیّت اور مزاح کی بوالعجبی کو انشائیے کے مزاج پر غلبہ پانے کی اجازت نہیں دی۔ اس ضمن میں مشاق قمر نے لکھا ہے کہ:

> ''اسلوب کی شگفتگی انشائیے کا ایک لازمی جزو ہے۔ لیکن شگفتگی اسلوب کو 'چہل'، 'ٹھٹھ' یا 'مزاح' کے ہم پلہ گرداننا درست نہیں۔ کیونکر یہ اصطلاحیں مقصود بالذات کے زمرے میں آتی ہیں جبکہ انشائیہ نگار کا مقصد مزاح پیدا کرنے کی جبری یا شعوری کوشش ہرگز نہیں ہوتا۔''
> (مشاق قمر، انشائیہ نگاری، اوراق لاہور، اپریل مئی ۱۹۷۵ء، ص : ۲۴۶)

مرزا حامد بیگ نے خیال ظاہر کیا کہ:

> ''انشائیہ موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے سراسر مزاحیہ نہیں، یہ انسان سے تعلق کے باوجود زندگی اور زندگی کرنے والوں کی خصلت میں ناہمواریوں کی تلاش نہیں کرتا۔ نہ ہی اس کا چلن satire کا ہے جس کا جنم جھنجھلاہٹ سے ہے اور جس میں طنز نگار کی شخصی برتری کا پہلو نمایاں ہو کر تلخ اندیشی، نفرت اور حقارت اگلتا ہے۔ یہ پیروڈی بھی نہیں ہے۔ اس طرح طنز اور تحریف کی ناپسندیدگی کی حدود میں لانے کی خواہش بھی دم توڑ دیتی ہے۔ irony سے بنیادی ضروریات کی سطح پر انشائیہ کا کوئی علاقہ نہیں۔'' (مرزا حامد بیگ، انشائیہ کی کونپل، اوراق، جنوری فروری ۱۹۸۷ء، ص ۲۰۹:)

مشاق قمر اور مرزا حامد بیگ کے مندرجہ بالا تجزیے کے پس پشت یہ حقیقت کار فرما نظر آتی ہے کہ طنز میں خیال یا واقعے کا شوخ رنگ ابھرتا ہے، مزاح موضوع کا چہرہ مسخ کر دیتا ہے جبکہ انشائیہ موضوع، خیال اور مظہر کو شگفتہ خیالی سے منور کر ڈالتا ہے۔ انگریزی انشائیوں کے ایک نقاد ارل آف برکن ہیڈ نے جب دیکھا کہ انگریزی انشائیہ اپنی اس مخصوص شخصیت سے محروم ہو چکا ہے جو اسے مانتین نے عطا کی تھی اور اب یہ صنف ہر قسم کی ذہنی قلابازیوں کے لیے استعمال ہو رہی ہے تو اس نے بڑے تاسف کا اظہار کیا۔ وجہ یہ کہ ادبا کے اس عمل سے انشائیہ نگار اپنی اس معطر تنہائی سے محروم ہو گیا تھا جہاں وہ فراغت کی کیفیت میں خود اپنے ہی افکار سے محظوظ ہوتا چلا جاتا ہے۔ (بحوالہ تنقید اور مجلسی تنقید، ص ۷۲ :—۷۳) برکن ہیڈ نے لکھا ہے کہ ''انگریزی میں اچھے 'ایسیز' کی تعداد بہت کم ہے۔'' اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ برکن ہیڈ کے دور میں انگریزی انشائیے پر صحافیانہ قسم کی طنز اور سہل نگارانہ قسم کے مزاح نے یلغار کر دی تھی جس سے خالص انشائیہ کا مزاج مجروح ہوا اور ہموار سطح سے ابھرنے والی شگفتگی دب کر رہ گئی۔

بادی النظر میں طنز و مزاح کے چھینٹے ادب کی دیگر اصناف مثلاً ناول، افسانہ، ڈرامہ، نظم، غزل، مثنوی حتیٰ کہ مرثیہ تک میں مل جاتے ہیں اور انشائیہ کو بھی مستثنیٰ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ تاہم اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ طنزیہ، مزاحیہ اور انشائی رویے میں بنیادی فرق موجود ہے۔ طنزیہ رویے میں ہمدردی کا شدید فقدان ملتا ہے۔ مزاحیہ رویے کا بنیادی مقصد ہنسی کو تحریک دینا ہے اور اکثر اوقات حصول مقصد کے لیے چہرہ بگاڑنے اور مظاہر کی شکل مسخ کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ ان دونوں کے برعکس انشائی رویہ

نئے نکتے کی دریافت، طمانیت اور مسرت کی امتزاجی صورت کو جنم دیتا ہے۔ اول الذکر دونوں صورتوں میں قاری منظر سے دور کھڑا رہتا ہے لیکن موخر الذکر صورت میں قاری خود بھی ناظر کی حیثیت اختیار کرلیتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل انشائیہ اور طنزومزاح کے اس امتیازی فرق کو واضح کرنے کے لیے سلیم آغا قزلباش نے مشہور طنزومزاح نگار کنہیا لعل کپور کا مضمون 'بڑھاپا' چنا اور اس کا موزانہ اسی موضوع پر لکھے گئے مشاق قمر کے انشائیہ سے کیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کنہیا لعل کپور نے بڑھاپے کی ناہمواریوں کو اجاگر کیا ہے۔ وہ خود بھی ہنستے ہیں اور دوسروں کو بھی ہنساتے ہیں اور اس مزاحی عمل میں موضوع کے داخل میں چھپی ہوئی تہہ در تہہ کیفیات سے سروکار نہیں رکھتے، اس کے برعکس مشاق قمر نے بڑھاپے کی مضحک صورت کو ابھارنے کے بجائے ہمیں ایک بالکل نئی انوکھی صورت حال سے دوچار کیا، موضوع کو تخلیقی سطح پر محسوس کیا اور اس کے مخفی مفاہیم کو سطح پر لانے میں کامیابی حاصل کی۔ (سلیم آغا قزلباش، روبرو، اوراق، جولائی اگست ۱۹۷۸ء، ص ۷۱: تا ۷۸) آگے بڑھنے سے قبل کنہیا لعل کپور کے مضمون سے مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں بڑھاپے سے پیدا ہونے والی بوالعجبی کو ہمارے سامنے قہقہہ آور انداز میں پیش کیا گیا ہے:

> ''کل شام ایک عجیب واقعہ ہوا، شہر کے بہترین سینما ہال میں شیکسپیئر کے مشہور ڈرامے 'رومیو جیولیٹ' کی فلم دکھائی جارہی تھی ۔لاکھ کوشش کے باوجود ہم سے صبر نہ ہوسکا۔ چنانچہ نوجوانوں کی آنکھ بچاتے ہوئے سینما ہال میں داخل ہوگئے۔ ابھی فلم شروع ہونے میں کچھ دیر تھی۔ اب دیکھتے کیا ہیں کہ ہر نوجوان ہماری طرف دیکھ دیکھ کر گھور رہا ہے جیسے ہم سے کسی ناقابل معافی جرم یا گناہ کا ارتکاب ہوگیا ہو، پیچھے سے آواز آئی 'بال سفید ہوگئے ہیں لیکن ابھی دم خم باقی ہے۔' ہم نے یہ سنا اور جل بھن گئے۔ خدا جانے ابھی اور کیا کچھ سنتے کہ فلم شروع ہوگئی۔ انٹرول میں جب روشنی ہوئی تو تین چار نوجوان جنھیں ہم جانتے تھے ہمارے آس پاس بیٹھے ہوئے پائے گئے۔ وہ حیران ہوکر پوچھنے لگے 'قبلہ آپ یہاں کیسے؟' ہم نے شرمندہ ہوکر جواب دیا 'یونہی بیٹھے بیٹھے طبیعت گھبرا گئی تھی، یہاں چلا آیا۔' وہ ہمیں بنانے لگے 'کہیے جیولیٹ پسند آئی۔ دراصل ایسی فلمیں آپ جیسے بزرگوں کے لیے ہی بنائی جاتی ہیں، ہم چھوکرے تو یونہی آدھمکتے ہیں' وہ دن اور آج کا دن ہم کبھی فلم دیکھنے نہیں گئے۔'' (کنہیا لعل کپور، اقتباس از اوراق، جولائی اگست ۱۹۷۸ء، ص ۷۵:)

مشاق قمر نے مضحک صورت واقعہ ابھارنے اور خفّت سمیٹنے کے بجائے بڑھاپے کے خارجی اور داخلی پہلوؤں پر عمیق نگاہ دوڑائی اور وہ اس دور حیات کی ظاہری اور باطنی تبدیلیوں سے ہی واقف نظر نہیں آتے بلکہ اس کی طرف محبت کا ہاتھ بھی بڑھاتے ہیں اور اسے پرے نہیں جھٹکتے، اس ضمن میں مشاق قمر کے متذکرہ انشائیہ کے چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

> ''بڑھاپا دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جس کا تعلق آپ کے داخل سے ہے اور جو خودرد پودے کی طرح آپ کی داخلی سطح پر اگ آتا ہے۔ اس قسم کا بڑھاپا آپ کا دوست نہیں جانی دشمن ہے جو دنیائے آب وگل میں قدم رکھتے ہی آپ کو دبوچ لیتا ہے اور پھر لحہ بہ لحہ آپ پر اس کی گرفت مضبوط ہوتی جاتی ہے، حتیٰ کہ حیات کا ہرا بھرا درخت ٹنڈ منڈ ہوجاتا ہے... دوسری قسم کے بڑھاپے کا تعلق آپ کے خارج سے ہے کیونکہ ہرچند ظاہری طور پر آپ بڑھاپے کی ردا زیب تن کرلیتے ہیں لیکن آپ کے داخل کے بارے میں کچھ

کہنا ممکن نہیں ہوتا... یہ بڑھاپا (جسے میں اصلی اور فطری بڑھاپا کہوں گا) ماہ وسال کے پربت سے پھسلتا ہوا دور نیچے ڈھلوان میں دبے پاؤں آپ کو آلیتا ہے اور ہولے سے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہتا ہے 'امید ہے کہ آپ نے مجھے پہچان لیا ہوگا'... بچپن آپ کا دوسروں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیتا ہے... لڑکپن آپ کے ناک میں نکیل ڈال کر گلی گلی نچاتا پھرتا۔ جوانی آپ سے آپ کا سب کچھ چھین لیتی ہے... یہ بڑھاپا ہی ہے جو آپ کا چھنا ہوا سارا سرمایہ مع سود لوٹا دیتا ہے...'' (مشتاق قمر، اقتباس از اوراق، جولائی اگست ۱۹۷۸ء، ص ۷۲ :۔ ۷۳)

واضح رہے کہ سلیم آغا کا مقصد مشتاق قمر کو کنہیا لعل کپور سے بہتر لکھنے والا ثابت کرنا نہیں تھا، بلکہ انھوں نے یہ اعتراف کیا ہے کہ ''جہاں تک طنز ومزاح کے میدان کا تعلق ہے کنہیا لعل کپور کی حیثیت منفرد اور یکتا ہے۔'' (سلیم آغا قزلباش، ایضاً، ص ۷۳:)

سلیم آغا کا مقصد تو اس بات کی صراحت کرنا تھا کہ متذکرہ دو ادبا کی تخلیق کاری کے میدان ہی مختلف ہیں۔ لہٰذا ان کی تخلیقات سے مختلف نوعیت کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ کپور نے اپنی مخصوص افتادِ طبع کے باعث 'بڑھاپا' پر ایک طنزیہ مزاحیہ مضمون لکھا اور مشتاق قمر اسی موضوع پر انشائیہ لکھنے میں کامیاب ہوئے۔ (سلیم آغا قزلباش، ایضاً)

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ طنز ومزاح انشائیہ کے لیے نہ شجر ممنوعہ ہے اور نہ اس کا جزو لاینفک ہے۔ چنانچہ نظیر صدیقی نے ان لوگوں سے اختلاف کیا ہے جو انشائیہ کو مزاح اور طنز نگاری کا مترادف سمجھتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

> ''انشائیہ عموماً طنز ومزاح سے خالی نہیں ہوتا۔ پھر اسے طنز یا مزاح نگاری کا مترادف سمجھنا درست نہیں۔'' (نظیر صدیقی، بحوالہ ادبی دنیا، شمارہ نہم، دور پنجم)

انشائیہ میں جو شگفتگی ملتی ہے وہ اولاً انشائیہ نگار کے داخل کی فطری شگفتگی ہے اور یہ موڈ (mood) کی بشاشت کے ساتھ ہی انشائیہ میں خود بخود سما جاتی ہے۔ انشائیہ نہ زندگی کی منطق کی تفسیر ہے اور نہ تنقید۔ چنانچہ اس کا خالق اپنی ذات کو تہذیب وتمدن کی جکڑ بندیوں میں قید نہیں کرتا بلکہ اپنے آپ کو پنچھی کی طرح کھلی ہواؤں میں اڑنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ وزیر آغا نے خیال ظاہر کیا ہے کہ:

> ''انشائیہ کا خالق اس شخص کی طرح ہے جو دفتر سے چھٹی کے بعد اپنے گھر پہنچتا ہے، چست اور تنگ سا لباس اتار کر ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن لیتا ہے اور ایک آرام دہ موڑھے پر نیم دراز ہو کر اور حقے کی نے ہاتھ میں لیے انتہائی بشاشت اور مسرت سے اپنے احباب سے مصروف گفتگو ہو جاتا ہے۔'' (ڈاکٹر وزیر آغا، بحوالہ خیال پارے)

چنانچہ اس تفریحی ماحول میں وہ آزادہ فکری اور بشاشت طبعی سے کسی موضوع پر جو کچھ سوچتا ہے وہ لاشعوری طور پر شگفتگی کا حامل اور انشائیہ کے مزاج کے مطابق ہوگا۔ انشائیہ میں شگفتگی کا ایک اور سبب وہ زاویۂ نگاہ بھی ہے جس سے انشائیہ نگار اشیا اور مظاہر پر محبت اور ہمدردی کی نظر ڈالتا ہے۔ اس عمل میں تخلیق کار چونکہ خیال کے نئے منطقوں کی سیاحت کرتا اور فکر وخیال کے نئے نئے گوشے دریافت کرتا ہے اس لیے ہر نئی دریافت اسے شگفتگی کی ایک نئی نہایت سے دوچار کرتی اور اس کے فطری تجسس کو مسرت اور طمانیت عطا کر دیتی ہے۔ انشائیہ میں ہر نکتہ پکے ہوئے تجربے کی طرح ظاہر ہوتا ہے، اس میں نا ہضم یا کچی باتوں کا اظہار نہیں ہوتا۔ اس کے پیکر میں تو صرف وہی باتیں سما سکتی ہیں جو انشائیہ نگار کے مشاہدے سے سالہا سال تک چھنتی رہتی اور لاشعور کے پاتال میں منہ بند سیپ کی طرح محفوظ ہوتی جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ تخلیق کا وہ لمحہ آجاتا ہے جب انشائیہ نگار اس سمندر

میں ایک گہرا غوطہ لگاتا ہے اور اس گوہر ناسفتہ کو برآمد کر لیتا ہے۔ رابرٹ لنڈ نے لکھا ہے کہ:

"اچھا انشائیہ نگار ہر غوطے کے ساتھ ایک خزانہ لے آتا ہے۔ لیکن ناپختہ انشائیہ نگار بار بار کے غوطے کے باوجود بھی خالی ہاتھ ہی لوٹتا ہے۔" (رابرٹ لنڈ، بحوالہ ذکراس پری وش کا)

لاشعور کے سمندر سے خزینے کی دریافت داخلی طور پر جو مسرت انشائیہ نگار کو عطا کرتی ہے وہ انشائیہ نگار کے پیکر میں شگفتگی کی رو بھی دوڑا دیتی ہے، پس انشائیہ نگار کی شگفتگی محض مسکراہٹ کی نمود سے عبارت نہیں بلکہ یہ اکتساب علم، نکتۂ نو کی افزائش، خیال کی جدت تخلیق کی سبک روی، مزاح کی لطافت، حیرت کی افزائش اور طنز کی لطیف چابکدستی سے بھی پیدا ہوتی ہے اور ایک انشائیے کی یہی خوبی اسے دوسری اصناف سے ممیز اور ممتاز کرتی ہے۔

انشائیہ اور تسلسل خیال:

انشائیہ کے لیے جس آزادہ روی کا ذکر گزشتہ اوراق میں کیا گیا ہے وہ بالعموم انشائیہ میں تسلسل خیال کی صورت میں بھی سامنے آتی ہے۔ انشائیہ کا وہ مخصوص مزاج جسے ڈاکٹر جانسن نے ذہن کی آزاد ترنگ (A loose sally of the mind) کہا ہے اور جس کے لیے وزیر آغا نے ایک 'غیر رسمی طریق کار' کی ترکیب استعمال کی ہے۔ دراصل تسلسل خیال کے مسئلے کو ہی سطح پر ابھارتی ہے۔ اردو کی دوسری تخلیقی اصناف مثلاً افسانہ، ناول، داستان اور مضمون وغیرہ میں تخلیق کار کو اپنا ذہن آزاد چھوڑ دینے کی اجازت نہیں۔ وہ ابتدائے سفر میں ہی اپنی منزل کا تعین کر لیتا ہے اور پھر قدم بہ قدم اس منزل کی طرف لپکتا چلا جاتا ہے لیکن انشائیہ اتنے کڑے نظم وضبط کا متحمل نہیں ہو سکتا اور یہ دوسری اصناف کی طرح فنی رکھ رکھاؤ کو بھی قبول نہیں کرتا۔ یہ واحد صنف ادب ہے جس میں ادیب کو ادھر ادھر تانکنے جھانکنے اور مسرت کشید کرنے کے لیے زندگی کو انوکھے زاویوں سے دیکھنے کی اجازت ہے اور یہ اس آزادی کا ہی ثمرہ ہے کہ انشائیہ نگار کے ہاں خیال کی رو بھی کسی معین سمت میں سفر نہیں کرتی۔ دوسری اصناف میں منزل مقصود ادیب کے سامنے ہوتی ہے اور وہ سیدھی سڑک پر سفر کرتا ہے لیکن انشائیہ نگار پگڈنڈی پر سفر کرتا ہے اور پگڈنڈی کی کیفیت یہ ہے کہ یہ کبھی منزل نما بن جاتی ہے اور کبھی مسافر کو راستے میں ہی گم کر دیتی ہے۔ اس سب کے باوجود پگڈنڈی کا سفر نہ صرف خیال کی رد کو مہمیز لگاتا ہے بلکہ یہ نئے تجربات سے آشنا بھی کرتا ہے اور راستے کو اسرار کو نئے انداز میں منکشف بھی کرتا ہے۔

انشائیہ میں خیال کی رو بھی آزادی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ انشائیہ نگار اپنے آپ کو موضوع اور خیال کا قیدی بنا لینے کے بجائے اس سے ایک آزادہ فکر فنکار کی طرح کھیلنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ فطری انداز میں اٹھکیلیاں کر سکے اور وہ کیفیت پیدا کر دے جسے آپ شگفتن ذات کی کیفیت کہتے ہیں۔ سعد اللہ کلیم نے لکھا ہے کہ:

"انشائیے میں خیالات کی بھیڑ بھاڑ کے اندر سے اصل موضوع ڈھونڈھنا نہیں پڑتا۔ موضوع سامنے رہتا ہے اگرچہ دور چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ذرا سا نقطہ رہ جاتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ قریب آنے لگتا ہے۔" (سعد اللہ کلیم، انشائیہ مقبولیت کی راہ پر، اوراق، افسانہ و انشائیہ نمبر، ۱۹۷۲ء، ص ۲۳۸:)

بالفاظ دیگر انشائیہ میں ادیب موضوع کی ڈور کو اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے لیکن خیال کی پتنگ کو یوں اڑاتا ہے کہ وہ ہوا میں ہر چہار جانب لپکتی چلی جاتی ہے۔ کبھی یہ پتنگ براق کی طرح آپ کے سامنے رقص کرتی ہے، کبھی یہ تارہ سی بن جاتی ہے۔ (ڈاکٹر وزیر آغا نے اس تمثیل کو کبوتر کی پرواز سے واضح کیا ہے۔ بحوالہ اوراق، حوالہ ایضاً، ص ۲۳۸:) اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ڈور ٹوٹ جاتی ہے اور اڑتی ہوئی پتنگ

زمین کے ساتھ ٹکرا کر ہمیشہ کے لیے معدوم ہو جاتی ہے۔

اس مثال سے میں درحقیقت یہ بات باور کرانا چاہتا ہوں کہ جس طرح انشائیہ کے لیے موضوع کی قید نہیں اور زندگی کے معمولی سے معمولی موضوع پر بھی ایک غیر معمولی انشائیہ تخلیق کیا جاسکتا ہے اسی طرح انشائیہ میں خیال کی رو کے آگے بند باندھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے اور یہ جس سمت میں چاہے بے تکان اڑان کر سکتی ہے۔ انشائیہ میں خیال خودرو ہوتا ہے۔ یہ ایک آزاد ندی کی طرح موڑ کاٹتا ہے لیکن پھر بڑے دھارے کے ساتھ جا کر مل جاتا ہے اور یہ صرف ایک مرتبہ نہیں بلکہ بار بار ہوتا ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انشائیہ نگار کو یہ آزادی بھی حاصل ہے کہ وہ اختصار لفظی، کفایت خیالی، شائستگی اظہار اور تازگی فکر کو تج کر انشائیہ کے ساتھ کھلنڈرے بچوں جیسا سلوک کرنے لگے اور اس پگڈنڈی کو جس کا سفر مسرت کی ایک نئی نوعیت کو جنم دیتا ہے سرابوں میں یوں گم کردے کہ اس سے بوریت، اکتاہٹ اور بے رنگی پیدا ہو جائے۔ انشائیہ میں تسلسل خیال کی آزادی درحقیقت اس صنوبر کی آزادی کے مترادف ہے جس کے پاؤں گہری زمین میں گڑے ہوئے ہیں اور جس کی پھننگ کھلی فضا میں جھوم سکتی ہے۔ چنانچہ انشائیہ نگار متعدد آزادیوں کے باوصف مرکزی پابندی کو خود اپنے لیے قبول کرتا ہے اور تھوڑی سی آزادہ خرامی کے بعد ہمیشہ اپنے بنیادی موضوع کی طرف لوٹ آتا ہے اور یوں خیال کی مرکزیت کو نہ صرف قائم رکھتا ہے بلکہ اسے آوارہ ہونے سے بھی روکتا ہے۔ اس نقطے کی وضاحت کے لیے میں ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیہ 'فٹ پاتھ' کا ابتدائی پیراگراف پیش کرتا ہوں۔ مطالعے سے قبل یہ گزارش ضروری ہے کہ انشائیے کے عنوان کو ملحوظ نظر رکھئے اور دیکھئے کہ انشائیہ نگار 'فٹ پاتھ' میں خیال کی رو کو آزادہ روی کی اجازت دینے کے باوجود کس طرح اپنے قلم کو آوارہ ہونے سے بچاتا ہے۔ وزیر آغا لکھتے ہیں:

"جب سرخ ساڑھی میں لپٹی ہوئی شام آسمان کے بام و در سے لحظہ بھر کے لیے جھانکتی ہے تو میں چھڑی ہاتھ میں لیے گنجان سڑک سے لپٹے ہوئے فٹ پاتھ پر چہل قدمی کے لیے نکل آتا ہوں۔۔۔ اس امید کے ساتھ کہ شاید میں آج اس حسینۂ فلک کے درشن کر سکوں لیکن آسمان سے آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی دیواروں کے اس شہر میں میری نظریں اس تک پہنچ ہی نہیں پاتیں، اس کے بجائے میں اس سیاہ پوش، بپھرے ہوئے جم غفیر کا مطالعہ کر کے لوٹ آتا ہوں جو میرے دائیں ہاتھ بہتی ہوئی سڑک پر سائیکلوں، ٹانگوں، موٹروں اور رکشاؤں میں رواں دواں ہے، اس وقت مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں کسی تیز رفتار پہاڑی دریا کے کنارے یا متلاطم سمندر میں گھرے ہوئے کسی خاموش اور تنہا جزیرے میں کھڑا سرکش موجوں کا نظارہ کر رہا ہوں۔ یہ منظر اس محرومی کی بدرجۂ اتم تلافی کر دیتا ہے جو شام کے درشن نہ ہو سکنے کے باعث میرے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔" (ڈاکٹر وزیر آغا، فٹ پاتھ)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ وزیر آغا نے موضوع تو فٹ پاتھ کو بنایا ہے لیکن اپنے خیال کی رو کو صرف فٹ پاتھ کے ساتھ چسپاں نہیں ہونے دیا بلکہ انھوں نے موضوع کو اس آئینے کی طرح استعمال کیا ہے جس کے ساتھ خیال کی لہریں ٹکراتی اور پھر واپس آتی ہیں تو ایک نئی قوس قزح پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ فٹ پاتھ پر چہل قدمی، حسینۂ فلک کے درشن اور خیال افروز شام سے ملاقات کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ خیال کی رو موٹروں، تانگوں اور سکوٹروں کے سیلاب سے ٹکراتی ہے تو انشائیہ نگار کے سامنے تلاطم سمندر کا تصور ابھرتا ہے اور فٹ پاتھ ایک ایسا جزیرہ بن جاتا ہے جہاں انشائیہ نگار تنہا کھڑا سرکش موجوں کا نظارہ کر رہا ہے اور ان سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔

اس انشائیے سے مزید اقتباسات پیش کرنا شاید طول کلام کا باعث ہوگا۔ تاہم

آپ ذرا آگے بڑھیں تو انشائیہ نگار سڑک اور فٹ پاتھ کے فرق پر ایک اچٹتی ہوئی نگہ ڈالتا ہے، پھر اس فرق کی توضیح ادب کے حوالے سے کرتا ہے اور یوں کئی ایسی گرہیں کھول دیتا ہے جن کی طرف ہم نے اس سے قبل توجہ دینے کی یا تو ضرورت محسوس نہیں کی اور اگر توجہ دی بھی تو نہایت سطحی اور مضحک انداز میں۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انشائیہ میں خیال کی رو کسی ایک مخصوص جہت میں نہیں لپکتی بلکہ یہ انشائیہ نگار کے ذوق اور فطرت کے مطابق متعدد سمتوں میں سفر کرتی اور بہت سی اشیا اور مظاہر کو مس کرتی ہے اور ہمیشہ بہجت اور مسرت کی ایک نئی کیفیت کو جنم دیتی ہے۔ خیال کے تسلسل کی یہ آزادی کسی اور صنف میں اس طور موجود نہیں جیسے انشائیہ میں دستیاب ہے۔ چنانچہ یہ انشائیہ کی ایک اور امتیازی خوبی تصور ہوتی ہے۔

غیر رسمی طریق:

تسلسل خیال کی متذکرہ بالا خصوصیت نے انشائیہ کے مزاج کو ایک غیر رسمی طریق سے بھی آشنا کیا ہے اور اس کی یہ خوبی اسے مقالہ یا مضمون سے الگ نوعیت کی منفرد صنف ادب ثابت کرنے میں بھی معاونت کرتی ہے۔ ڈاکٹر سید محمد حسنین نے لکھا ہے کہ:

"مقالہ کی امتیازی خصوصیت سنجیدگی ہے، عالمانہ اور فکر خیز سنجیدگی، مقالہ نگار کسی موضوع پر سنجیدگی سے روشنی ڈالتا ہے۔ یہ روشنی براق ہوتی ہے، ایسی براق کہ نفس تحریر کا ہر گوشہ منور ہو جاتا ہے۔" (ڈاکٹر سید محمد حسنین، صنف انشائیہ اور انشائیے، ص ۱۵:)

بالفاظ دیگر مقالہ ہماری دانش اور معلومات کے خزینے میں اضافہ کرتا ہے۔ نا آگہی کے اندھیروں کو آگہی کی روشنی سے منور کرتا ہے۔ مقالے کا اپنا ایک مضبوط منطقی نظام ہے اور یہ لاسے الا اللہ کی منزل تک بتدریج پہنچتا ہے۔ بصیرت کو مزید تابناک بنانے کے لیے انسان کے سامنے نہ صرف ٹھوس حقائق کے انبار جمع کرتا چلا جاتا ہے بلکہ معین منزل کی طرف راہنمائی بھی کرتا ہے۔ مقالے کا اسلوب سائنسی اور استخراجی ہے۔ موضوع کے حسن و قبح کی بحث میں ٹھوس دلیل اس کی سب سے بڑی معاون ثابت ہوتی ہے۔ مقالہ نگار کبھی زندگی کے رازہائے سربستہ کو آشکار کرتا ہے، کبھی آفاق پر کمندیں ڈالتا ہے اور کبھی اخلاق جلالی کے انداز میں وعظ و نصیحت پر اتر آتا ہے۔ چنانچہ مقالہ نگار دوست کے بجائے مصلح کا اور یار آشنا کے بجائے راہنما کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ وہ ہمیں اپنی علمی فضیلت اور فکری بصیرت سے متاثر اور مرعوب کرنے کی کوشش کرتا ہے، فکر و فلسفہ کے نئے نئے سوال اٹھاتا ہے اور انہیں عالمانہ خرد افروزی سے حل کرنے کی سعی کرتا ہے۔

مقالہ کے برعکس مضمون کی اصطلاح نسبتاً بیضوی ہے اور یہ ہر قسم کی نثری تحریر پر بآسانی چسپاں کر دی جاتی ہے۔ ابتدائی باب میں عرض کیا جا چکا ہے کہ مضمون کی نوعیت درسی قسم کے سوالوں کے واضح اور مستقیم جواب کے مماثل ہے۔ سید احتشام حسین، ڈاکٹر آدم شیخ، صفی مرتضیٰ، ڈاکٹر سیدہ جعفر اور عرش صدیقی نے انشائیہ کو انگریزی اصطلاح 'ایسے' کے مترادف سمجھتے ہوئے اسے مضمون کے قریب ترلانے کی سعی کی ہے۔ محمد ارشاد صاحب نے تو واضح طور پر لکھا ہے کہ:

"صنف انشائیہ ~~کے اردو نقاد کے پاس ایسی کوئی بنیاد باقی~~ نہیں رہتی جس کے مطابق انشائیہ کے مضمون ہونے سے انکار کر سکیں۔"
~~(محمد ارشاد، مانتین، انشائیہ اور انشائیہ نگار، فنون، جولائی اگست~~ ۱۹۸۲ء)

~~انھوں نے دلیل یہ دی ہے کہ پرسنل ایسے (انشائیہ) اس ایسے (مضمون)~~ کو کہا جاتا ہے جو 'پرسنل' (شخصی) ہونے کی صنعت سے متصف ہو۔۔۔ اس صفت کی بنا پر وہ اپنی جنس (مضمون) سے خارج نہیں ہوتا۔ ہر انشائیہ مضمون ہی ہوتا ہے۔ (محمد ارشاد، مانتین، انشائیہ اور انشائیہ نگار، فنون، جولائی اگست ۱۹۸۲ء)

محمد ارشاد صاحب کی متذکرہ بالا دلیل اس لیے قابل قبول نہیں کہ مغرب میں 'پرسنل ایسے' کو بہت عرصہ پہلے 'ایسے' سے الگ کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ لوک (locke) کے عظیم فلسفیانہ مضامین 'انسانی دانش کے بارے میں مضمون' (Essay ?????ing the Human Understanding) مالتھس کے مضمون 'آبادی کے اصول' (Essay of the ??????? Population) مل کا وہ مقالہ جو اس نے 'آزادی' پر لکھا تھا اور لارڈ میکالے کے تین گرانقدر مجموعۂ مضامین کو 'ایسے' کے سابقے کے باوجود ان معانی میں 'ایسے' شمار نہیں کیا گیا جیسے مانتین، ایڈیسن، رابرٹ لنڈ اور چسٹرٹن وغیرہ کے مضامین کو 'ایسے' قرار دیا جاتا ہے۔ غلام جیلانی اصغر نے درست کہا ہے کہ:

"ماضی میں ادیب جب اپنے غیر متعین مضمون کے لیے کوئی اور موزوں لیبل تجویز نہ کرسکتا تو اسے 'ایسے' کہہ دیتا۔" (غلام جیلانی اصغر، ادبی دنیا، لاہور، دور پنجم، شمارہ نہم، ص ۲۵۶:)

چنانچہ والٹیر کی ایک تاریخی نوشت جسے وہ 'ایسے' کہتا ہے دوسو ابواب پر مشتمل ہے۔ انشائیہ کو مضمون میں ضم کرنے کے عمل کو ڈاکٹر وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، سجاد نقوی، جمیل آذر، ڈاکٹر سلیم اختر اور متعدد دوسرے ادبا نے قبول نہیں کیا۔ غلام جیلانی اصغر نے واضح کیا ہے کہ:

"میں نے (انشائیہ کی) اس مختصر بحث میں 'ایسے' کی صرف اس نوع کو مدنظر رکھا ہے جسے ہماری اصطلاح میں انشائیہ یا 'پرسنل ایسے' کہا جاتا ہے۔ تنقیدی یا نیم تنقیدی مقالے، سنجیدہ یا علمی مضامین جنھیں عام طور پر 'ایسے' کہا جاتا ہے ایک الگ مبحث ہیں۔" (غلام جیلانی اصغر، ادبی دنیا، لاہور، دور پنجم، شمارہ نہم، ص ۲۵۶:)

ڈاکٹر سلیم اختر نے خیال ظاہر کیا کہ:

"انشائیہ کو بالعموم خلط ملط کرتے ہوئے مزاحیہ، طنزیہ یا پھر تاثراتی قسم کی شے سمجھ لیا جاتا ہے جو کہ قطعی غلط ہے۔ مضمون ایک عمومی اصطلاح ہے۔ نہ ہی اپنی انفرادی حیثیت میں مضمون کوئی جداگانہ صنف ہے۔" (ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کیوں؟، اوراق، انشائیہ نمبر، مارچ اپریل ۱۹۷۲ء، ص ۲۳۳:)

سجاد نقوی نے وضاحت کی کہ:

"انگریزی ادب میں جو صنف 'لائٹ ایسے' سے موسوم ہے اردو ادب میں اس کے لیے انشائیہ کی اصطلاح مستعمل ہے۔" (سجاد نقوی، اردو انشائیہ اور اس کے خدوخال، اوراق، جنوری فروری ۱۹۷۷ء، ص : ۲۷۷)

مندرجہ بالا اجمال سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انگریزی ادب کی طرح اردو میں بھی انشائیہ کو مضمون سے الگ صنف قرار دیا گیا ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انشائیہ کے صنفی نقوش، مقتضیات اور محاسن میں انفرادیت موجود ہے۔ مضمون اور انشائیہ کا آپس میں رشتہ ضرور ہے لیکن یہ رشتہ ویسا ہی ہے جیسا کہ غزل اور قصیدے کے اشعار کے درمیان ہے۔ یہ دونوں نہ صرف شاعری کی اصناف سے متعلق ہیں بلکہ ان میں ہیئت کا اشتراک بھی موجود ہے لیکن مزاج دیکھئے تو ان دونوں میں کوئی قدر مشترک نظر نہیں آتی بلکہ زمین اور آسمان کا فرق ملتا ہے۔ جس طرح نظم اور غزل، قصیدہ اور مرثیہ، ہائیکو اور قطعہ وغیرہ اصناف سب شاعری کے زمرے میں تو شامل ہیں لیکن صنفی اعتبار سے اپنی الگ الگ پہچان بھی رکھتی ہیں۔ اسی طرح انشائیہ اور مضمون کا رشتہ یہ نہیں کہ دونوں مضمون کے دائرے میں آتے ہیں بلکہ یہ کہ دونوں نثر کے نمونے ہیں، اس امتیازی فرق کو واضح کرنے کے لیے ڈاکٹر وزیر آغا نے ادب کا ایک مختصر سا شجرہ مرتب کیا تھا۔ وضاحت احوال کے لیے میں اسے یہاں پیش کرتا ہوں۔ (ڈاکٹر وزیر آغا، انشائیہ کا سلسلۂ نسب)

ادب

↓

شاعری ← | → نثر

داستان ↓ ناول ↓ افسانہ ↓ ڈرامہ ↓ سوانح عمری ↓ سفرنامہ ↓ انشائیہ ↓ مضمون

↓ مضمون

طنزیہ مضمون ↓ مزاحیہ مضمون ↓ تنقیدی مضمون ↓ تحقیقی مضمون ↓ علمی مضمون ↓ فلسفیانہ مضمون

اس شجرے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ 'انشائیہ' مضمون کی شیلی نہیں بلکہ ایک الگ صنف ادب ہے۔ (وزیر آغا، حوالہ ایضاً) اور یہ ضروری نہیں کہ انشائیہ مضمون کے اسلوب میں ہی لکھا جائے بلکہ بعض اوقات انشائیے کے لیے افسانوی یا شاعرانہ اسلوب بھی اختیار کرلیا گیا مگر انشائیہ پھر بھی انشائیہ ہی رہا۔ افسانہ یا شاعری نہیں بنا۔

متذکرہ بالا بحث میں عرش صدیقی صاحب کے موقف کو کلیۃً تسلیم کرلیا جائے تو اردو ادب میں انشائیہ کا لفظ مروج کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی اور اگر اس لفظ کی موجودہ ترویج کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے تو طنزیہ انشائیہ، مزاحیہ انشائیہ، فکری انشائیہ اور خیالی انشائیہ وغیرہ متعدد نئی تراکیب بھی وضع کرنا لازم ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ انشائیہ طنز سے مناسب استفادہ کے باوجود انشائیہ رہ سکتا ہے۔ اسی طرح مزاح کو استعمال میں لائے بغیر اور طنزیہ مضمون طنز کے بغیر اپنی حیثیت قائم نہیں کرسکتا۔ بالفاظ دیگر مضمون اپنی وضاحت کے لیے کسی مخصوص سابقے کا محتاج ہے جبکہ انشائیہ ایک خود مختار اور خود کفیل صنف ادب ہے اور یہ اپنے مخصوص امتیازی خدوخال سے پہچانی جاتی ہے۔ آخری بات یہ کہ ایک مقالے کی طرح مضمون میں بھی منطقی اور استخراجی رویہ غالب رہتا ہے اور غیر رسمی طریق کار اس کے مضبوط داخلی نظام استدلال کو شکستہ کر ڈالتا ہے۔ مضمون اپنی ہیئت کو جامد رکھتا ہے جبکہ انشائیہ کی کوئی مخصوص ہیئت نہیں ہے۔ چنانچہ یہ سرگشتۂ خمار رسوم نہیں بلکہ رسمی قیود سے آزاد ہے اور انشائیہ نگار کی ذہنی پرواز کے ساتھ زندگی اور زمانے کی ہر جہت کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے آمادہ رہتا ہے۔ رسمی طریق کار کے مطابق ہم شے، مظہر اور موضوع کو معینہ زاویوں اور موجود صورت میں دیکھتے ہیں جبکہ غیر رسمی طریق عمل میں نہ صرف معینہ ترتیب بدل جاتی ہے بلکہ انشائیہ نگار اشیا اور مظاہر کو الٹتا، پلٹتا ہے یا پھر اپنے مشاہدے کا زاویہ تبدیل کرلیتا ہے۔ مرزا حامد بیگ نے ایک اچھا انشائیہ تخلیق کرنے کے لیے یہ شرط عائد کی ہے کہ:

> ''انشائیہ نگار شے، تجربہ یا واقعہ کو اکہری معنویت کے محدود دائرے سے باہر نکالے... جہاں وہ عمومی تجربے اور مشاہدے میں جڑیں پکڑ گیا ہے۔ یا پھر خود اس عمومی نظر کو خیرباد کہے جو موضوع میں دوہری معنویت پیدا نہیں ہونے دیتی۔'' (مرزا حامد بیگ، انشائیہ پر ایک نوٹ، اردو زبان، انشائیہ نمبر، مارچ اپریل ۱۹۸۳ء، ص ۱۵:)

انشائیہ کے اس غیر رسمی طریق کار سے بعض ناقدین نے یہ نتیجہ اخذ کرنے کی کاوش بھی کی ہے کہ انشائیہ نگار سنجیدہ باتیں غیر سنجیدہ انداز میں کہنے کی کوشش کرتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے وہ موضوع کے مضحک زاویوں کو ابھارتا اور دائم قدروں کو مجروح کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غیر رسمی انداز عمل انشائیہ نگار کو اظہار کی بہت سی آزادیاں عطا کر دیتا ہے لیکن وہ موضوع کی استقامت کو نہ تو مجروح کرتا ہے اور نہ قدروں کی صداقت پر ضرب لگاتا ہے۔ انشائیہ نگار تو پہلے موضوع کی آلائش دور کرتا ہے اور پھر اس کے باطن سے نکھرے ستھرے اور نایاب پہلوؤں کو دریافت کر کے قاری کی داخلی مسرت کو ایک نئی کروٹ دیتا ہے۔ انشائیہ نگار اس نہاریے کی طرح ہے جو دریائی ریت کو اتنا چھانتا ہے کہ برتن کی تہہ میں صرف چمکتا ہوا سونا رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عمل زیادہ صبر آزمائی، محنت اور جاں ماری کا عمل ہے اور سنجیدگی کار کے بغیر کامیابی کی منزل

سرنہیں کرسکتا۔غیر رسمی طریق کار سے مراد صرف یہ ہے کہ انشائیہ نگار آپ کے سامنے بھاری بھرکم دلیلوں اور بوجھل مسائل کے انبار لگانے سے گریز کرتا ہے۔ وزیر آغا نے اس کی توضیح کی ہے کہ:

"اس (انشائیہ نگار) کا کام محض یہ ہے کہ چند لمحوں کے لیے زندگی کی سنجیدگی اور گہما گہمی سے قطع نظر کر کے ایک غیر رسمی طریق کار اختیار کرے اور اپنے شخصی ردعمل کے اظہار سے ناظر کو اپنے حلقۂ احباب میں شامل کرلے۔" (وزیر آغا، خیال پارے، ص ا:)

غلام جیلانی اصغر نے غیر رسمی طریق کار کی مثال ایک انشائیہ 'گرمی' سے تلاش کی اور اس انشائیے کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"یہ انشائیہ بہار کی رخصت سے شروع ہوتا ہے اور پھولوں کی لاشوں سے گزرتا ہوا اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جب کہ آپ محسوس کرتے ہیں کہ پہاڑ اور درخت خاموش ہیں، عظیم اور ہیبت ناک ستارے اپنی ہی آگ میں جل رہے ہیں۔ جب یہ سیال اور متحرک جذبہ رواں دواں آگے بڑھتا ہے تو فوراً انشائیہ نگار نہایت چابکدستی سے آپ کے خیال کے ایک غیر معروف سے گوشے میں چٹکی لیتا ہے اور آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کے ذہن پر انکشاف کا ایک نیا در وا ہوا ہے، ویسے ہی جیسے مہاتما بدھ کو ایک نئی روشنی نظر آئی تھی۔" (غلام جیلانی اصغر، انشائیہ ایک بحث، ادبی دنیا، شمارہ نہم، دور پنجم، ص : ۲۵۵)

بالفاظ دیگر انشائیہ نگار ماچس کی تیلی سے قندیل روشن نہیں کرتا بلکہ یہ بکھری ہوئی شعاعوں سے روشنی کی کرن ڈھونڈتا ہے اور آپ کے داخل کے اندھیرے کو نئے نکتے سے منور کر ڈالتا ہے۔ اور وہ بھی یوں کہ "عوامی نقطۂ نظر بالکل بودا یا غلط نظر آنے لگتا ہے۔" (ایضاً) اس عمل میں انشائیہ نگار صادق قدروں کی تکذیب نہیں کرتا، وہ حقیقت کی نفی بھی نہیں کرتا بلکہ حقیقت کے اثبات کے لیے نیا زاویہ تراشتا ہے اور قدر کی نئی جہتوں کو ابھارتا ہے۔ چنانچہ جھوٹ اس کے نزدیک بھی جھوٹ ہی ہے اور بے حد قابل نفرت، اسی طرح سچ کی فوقیت مسلم ہے اور لیکن سچ کے پس پردہ ایک اور حقیقت بھی تو چھپی ہوئی ہے جس تک کم کوش قاری کی نظر نہیں جاتی۔ انشائیہ نگار غیر رسمی انداز میں اس چھپی ہوئی انوکھی حقیقت کو ہی دریافت کرتا ہے۔ مثال کے طور پر انشائیہ 'جھوٹ کی حمایت میں' کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"کہتے ہیں کہ ایک جھوٹ کی خاطر دس (اغلباً گیارہ) جھوٹ بولنے پڑتے ہیں، ممکن ہے نیک لوگوں نے یہ بات جھوٹ کی مذمت میں کہی ہو لیکن اس سے تو تعریف کا پہلو نکلتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی یہ کہے کہ ایک کتاب لکھنے کے لیے دس کتابیں پڑھنی پڑتی ہیں یا ایک غزل کے لیے بیس شعرا کی چوری کرنا پڑتی ہے (میرا مطلب ادبی سرقے سے ہے) اس بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تخلیق ادب کے لیے سخت محنت، ریاضت، گیان دھیان، تحقیق و تدقیق وغیرہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ ایک معمولی اور بے ضرر سا جھوٹ کہنے کے لیے بھی بے پناہ محنت اور فکری کاوش کی ضرورت ہوتی اور جھوٹ بولنے والے میں بلا کی دوراندیشی بلکہ دوربینی ہوتی ہے۔ وہ ابتدا میں ہی اس کے تمام سابقے اور لاحقے سوچ لیتا ہے، اس لحاظ سے وہ ماہر لسانیات کا ہم زلف ہوتا ہے کیونکہ دونوں ایسے ایسے صوتی اور لغوی رشتے تلاش کر کے لاتے ہیں کہ خود لفظ کو اپنی پیدائش پر ندامت ہونے لگتی ہے۔" (غلام جیلانی اصغر، انشائیہ جھوٹ کی حمایت میں)

مندرجہ بالا اقتباس کا طریق اظہار غیر رسمی اور انشائیہ کے مزاج کے مطابق ہے لیکن دیکھئے کہ عنوان میں اعلان بالجبر کرنے کے باوجود انشائیہ نگار نے جھوٹ کو پسندیدہ عمل ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ جھوٹ بولنے والا جن عملی مشکلات سے دوچار ہوتا ہے ان کا بہجت آفریں اظہار جداگانہ انداز میں کیا گیا ہے۔ اب کوئی شخص اگر اس انشائیے کو پڑھ کر جھوٹ بولنے پر آمادہ ہوجاتا ہے تو نتائج وعواقب کی ذمہ داری خود اس پر عائد ہوگی تاہم اگر کوئی شخص جھوٹ کے تمام سابقے اور لاحقے سوچ سکتا ہے اور اپنی دور اندیشی اور دور بینی، بے پناہ محنت اور فکری کاوش کو عمل میں لاسکتا ہے تو فاضل نقاد کا بھی فرض ہے کہ وہ اسے جھوٹ بولنے سے منع نہ فرمائیں بلکہ اس کی ذہانت کی داد دیں۔

مزید وضاحت کے لیے یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ سچ اور جھوٹ عالمگیر موضوعات ہیں، غلام جیلانی اصغر سے قبل صدہا مفکروں اور فلاسفروں نے ان اقدار کی ضرورت اور اہمیت متعین کرنے اور سچ کے فروغ میں حصہ لینے کی کاوش کی ہے لیکن حصول مقصد کے لیے بیشتر نے رسمی اور تبلیغی انداز اختیار کیا لیکن جب انشائیہ نگار نے اس موضوع کو مس کیا تو اپنے غیر رسمی طریق اظہار سے اس کی کایا پلٹ دی اور سچ جسے صحف سمادی سے رائج کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے اب فرد کی داخلی ضرورت بن کر نمودار ہوگیا۔

بالفاظ دیگر رسمی طریق کار قواعد وضوابط کی پابندیاں عائد کرتا ہے اور قاری کو دلیل و برہان کی تنگنائے سے گزارتا ہے اور بعض اوقات تو وہ ایسی بند گلی میں بھی پھنس جاتا ہے جس سے نکلنے کا راستہ ہی نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس انشائیہ اپنے غیر رسمی طریق کار سے لطف و انبساط اور انکشاف معانی کا ایک نیا جہان مرتب کرتا ہے اور قاری کو خیال کی ان پگڈنڈیوں پر چلنے کی دعوت دیتا ہے جن کی دونوں اطراف پر انواع واقسام کی جھنڈیاں اور قمقمے آویزاں ہیں اور قاری رنگ ونور کی اس دنیا سے حیرتوں اور مسرتوں کا وسیع ذخیرہ سمیٹتا چلا جاتا ہے۔

انشائیہ کے متذکرہ غیر رسمی طریق کار کی طرف زیادہ راہنمائی ڈاکٹر جانسن کی وضع کردہ اس تعریف سے بھی ہوتی ہے جس کے تحت انشائیہ کو ایک بے قاعدہ اور غیر منظم کمپوزیشن، ناہضم مواد کا بے ترتیب ٹکڑا اور دانش کی ڈھیلی ڈھالی اختراع قرار دیا گیا ہے۔ اس تعریف کی خوبی یہ ہے کہ ڈاکٹر جانسن نے انشائیہ کو ہر قسم کی پابندی سے مستثنیٰ قرار دے کر اسے فطرت کے بالکل قریب کردیا ہے۔ شاید اسی لیے انگریزی ادب کے ایک نقاد کا قول ہے کہ ''انشائیہ لکھنا اتنا ہی فطری ہے جتنا سانس لینا۔'' تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انشائیہ نگار کو بے پر کی اڑانے یا بے سروپا باتیں کرنے کی کھلی چھٹی ہے۔ اظہار کی اس وسیع رسمی آزادی کے باوجود انشائیہ سانیٹ کی طرح ایک نازک صنف ادب ہے۔ (فکر وخیال، مکتبہ اردو زبان سرگودھا، ص ۳۶:) اور مصنف کی ذرا سی بے احتیاطی سے اس کا پیکر ڈول جاتا ہے۔ انشائیہ کی بنت میں ناہضم یا کچی باتیں سما نہیں سکتیں بلکہ اس کے پیکر میں صرف وہی باتیں جگہ پاسکتی ہیں جو انشائیہ نگار کے بطون میں طویل عرصے تک محفوظ تھیں، حتیٰ کہ تخلیق کا وہ لمحہ آگیا جب انشائیہ نگار نے اپنے لاشعور میں غوطہ لگا کر انہیں برآمد کرلیا۔ مرزا حامد بیگ نے درست لکھا ہے کہ ''loose sally تو بے ربطی کا باعث بنتی ہے۔ انشائیہ خواہ کتنا ہی سبک اندام کیوں نہ ہو اس میں بہر طور ایک ربط ہوتا ہے۔'' (مرزا حامد بیگ، انشائیہ کی کونپل، اوراق، جنوری فروری ۱۹۷۸ء، ص ۲۱۰:)

چنانچہ انشائیہ میں غیر رسمی عمل بے راہ روی کا نام نہیں بلکہ ایک منظم آزادی کا آئینہ دار ہے اور مغرب ومشرق کے اعلیٰ پائے کے انشائیوں میں ایک مخصوص قسم کی داخلی تنظیم ضرور ملتی ہے جس سے خیال کی ڈور پھیلنے کے باوصف مرکزی نقطے کے گرد سمٹتی ہوئی بھی دکھائی دیتی ہے۔

کفایت لفظی:

غزل اور سانیٹ کی طرح انشائیہ لفظوں کے فالتو بوجھ کو قبول نہیں کرتا، غیر معمولی

طوالت یا بے جا تفصیلات اس کے داخلی مزاج کو درہم برہم کر ڈالتی ہیں۔ چنانچہ انشائیہ کے فنی تقاضوں میں اختصار اور کفایت لفظی کو بھی نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اختصار کو انشائی ادب کا بنیادی وصف قرار دیا ہے۔ (ڈاکٹر وحید قریشی، اردو کا بہترین انشائی ادب، ص ۲۲:) پیٹر ویسٹ لینڈ نے لکھا ہے کہ:

> ''انشائیہ صرف وہی ادیب لکھ سکتے ہیں جو موضوع کو محدود انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔'' (پیٹر ویسٹ لینڈ، انشائیہ کیا ہے؟، مفاہیم، ادب نمبر، ۱۹۸۰ء، ص ۲۱۰: ترجمہ مسعود ہاشمی)

چنانچہ اچھا انشائیہ نہ اتنا گتھا ہوا ہوتا ہے کہ قاری مسرت کشید کرنے کے عمل سے گزرنے ہی نہ پائے اور لفظوں کی تنگناؤں میں ہی الجھا رہے اور نہ اس میں اتنا پھیلاؤ ہوتا ہے کہ مرکزی خیال کی پتنگ فضا میں ابھرے تو ہوا اسے اپنے ساتھ بہا کر ایسی وادیوں میں لے جائے کہ واپس آنے کا امکان ہی باقی نہ رہے۔

عام طور پر کسی مضمون یا مقالے کے اختصار یا طوالت کا اندازہ صفحات کی تعداد اور لفظوں کی مقدار سے لگایا جاتا ہے۔ لیکن انشائیہ کے باب میں یہ پیمانہ کچھ زیادہ کارآمد ثابت نہیں ہوا۔ انشائیہ دو ایک صفحات کا بھی ہوسکتا ہے اور یہ پندرہ بیس صفحات کو بھی محیط کرسکتا ہے۔ بیکن کا انشائیہ 'سفر کے بارے میں' صرف دو صفحات میں سما گیا ہے جبکہ ہنری ڈیوڈ کا انشائیہ 'بغیر اصول کے زندگی' باریک ٹائپ کے انیس صفحات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے ابتدائی انشائیے مثلاً پگڈنڈی، آندھی اور بے ترتیبی وغیرہ خاصے مختصر ہیں لیکن کتابوں کی معیت میں اور حقہ پینا نسبتاً طویل انشائیے ہیں۔ جمیل آذر اور احمد جمال پاشا انشائیہ کے موضوعات کو اختصار سے پیش کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں لیکن غلام جیلانی اصغر، مشتاق قمر اور سلیم آغا قزلباش جب تک موضوع کے تمام گوشوں پر سیر حاصل روشنی نہ ڈال لیں انہیں اطمینان نہیں ہوتا، چنانچہ ان ادبا کے انشائیے نسبتاً طویل ہوتے ہیں۔

انشائیہ چونکہ انوکھے پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے اس لیے اس میں الفاظ جتنے کم اور چنیدہ ہوں گے، انوکھے پہلو اتنی ہی شدت سے ابھریں گے۔ طویل انشائیوں میں بعض اوقات غیر ضروری تفصیلات کا در آنا لابدی ہے جو نہ صرف تاثر کی گہرائی کو کم کر دیتی ہیں بلکہ اکثر اوقات انشائیہ کے بنیادی خیال پر بھی گرد کی دبیز تہہ جما دیتی ہیں۔ چنانچہ چابکدست انشائیہ نگار موضوع کو پھیلانے کے بجائے ارتکاز خیال کو عمل میں لاتا ہے اور مرکز گریزی کی صورت اختیار نہیں کرتا اور یوں پورے خیال کو چند لفظوں میں سمیٹنے کی سعی کرتا ہے۔

یہاں اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ انشائیے میں اختصار یا طوالت کے بارے میں کوئی مضبوط قاعدہ یا معین قانون وضع نہیں کیا گیا اور نہ ہی کیا جاسکتا ہے۔ انشائیہ نگار کو مجبور کرنا ممکن نہیں کہ وہ موضوع کو صفحات کی ایک مخصوص تعداد میں سمیٹ ڈالے، کچھ موضوعات ہی ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اظہار کی وسعت کا تقاضا کرتے ہیں اور محدود الفاظ یا صفحات میں سمیٹے نہیں جاسکتے۔ اسی طرح بعض اوقات انشائیہ نگار کا مشاہدہ اتنا بوقلموں اور شخصیت اتنی توانا ہوتی ہے کہ موضوع کے ساتھ مس کرتے ہی بے شمار نئے نکتوں کو جنم دے ڈالتی ہے۔ جس طرح بے جا طوالت مضمون کو پھیلا دیتی ہے اسی طرح بے اختصار بھی انشائیہ نگار کی غرابت فکر کو عریاں کر ڈالتا ہے۔ وزیر آغا نے درست کہا ہے کہ:

> ''انشائیہ نہ اتنا گھٹا ہوا ہو کہ احساس کے پر قطع ہو جائیں اور نہ اتنا پھیلا ہوا کہ یہ ہوا میں تحلیل ہو کر رہ جائے۔ (ڈاکٹر وزیر آغا، نئے مقالات، ص ۲۲۹:)

بلکہ مقصد یہ ہے کہ انشائیہ نگار موضوع کی مناسبت کو ملحوظ نظر رکھ کر ہی اس کی قد و قامت کا تعین کرے اور جونہی اس میں غیر ضروری باتیں در آنے لگیں وہ انشائیہ کو اچانک نقطۂ اختتام پر لا کر کسی نئی حیرت کو جگا دے اور یوں اپنے فکر و خیال کی افتادگی کو الفاظ کی موزوں ترین ضرورت سے متجاوز نہ ہونے دے۔

عدم تکمیل:

انشائیہ کے فن کی ایک اور امتیازی خصوصیت اس کی 'عدم تکمیل' ہے۔ انشائیہ موضوع پر حرف آخر کا درجہ نہیں رکھتا بلکہ جس طرح میزبان اپنے کسی مہمان کے ساتھ تمام باتیں ایک ہی نشست میں ختم نہیں کر ڈالتا بلکہ 'یار زندہ صحبت باقی' کے مصداق کچھ اگلی ملاقات کے لیے بھی اٹھائے رکھتا ہے اسی طرح انشائیہ کی خوبی بھی یہ ہے کہ اس میں کسی ضابطہ کی تکمیل کا احساس نہیں ہوتا بلکہ ایک گونہ تشنگی برقرار رہتی ہے۔ واضح رہے کہ مقالہ یا مضمون لکھتے وقت مصنف ایک مخصوص ضابطے کو پیش نظر رکھتا ہے اور اس کی مثبت اور منفی نکات کو ایک مخصوص ترتیب کے مطابق یوں ضابطۂ تحریر میں لاتا ہے کہ اس کا نقطۂ نظر کماحقہٗ طور پر ظاہر ہو جائے اور وہ قدم بہ قدم قاری کو ہمنوا بنانے میں کامیاب ہو جائے۔ چنانچہ اس قسم کی تحریروں میں موضوع پر تحلیلی یا تجزیاتی انداز میں نظر ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے اور مقصد اپنی ذات کے بجائے موضوع کے مختلف علمی اور فکری گوشے اجاگر کرنا ہوتا ہے۔ یہاں مصنف ایک دانشور کا فریضہ سرانجام دیتا ہے اور بالعموم اپنے آپ کو اونچی سطح پر رکھتا ہے اور اپنی تمام باتیں ایک ہی صحبت میں سمیٹ ڈالتا ہے، چنانچہ مقالہ اور مضمون جس تکمیل کا متقاضی ہوتا ہے انشائیہ کا مزاج اس تکمیل کا روادار نہیں۔ انشائیہ تو زندگی کے غیر مختتم کل میں سے صرف ایک ٹکڑے کو گرفت میں لیتا ہے اور اسے ایک ایسا شرار بنا دیتا ہے جس سے زندگی کے متعدد دوسرے گوشے روشنی کے ایک نئے مدار میں آجاتے ہیں اور قاری کو اپنی جانب متوجہ کر لیتے ہیں۔

انشائیہ ماضی اور حال سے شروع ہوتا ہے اور اپنی گرفت مستقبل پر قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پگڈنڈی کا راستہ اختیار کرنے کی وجہ سے اس کی گردش قدرے منحنی ہے لیکن یہ آگے بڑھنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ انشائیہ کے مزاج کا تجزیہ کیا جائے تو یہ غزل کے مزاج کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔ وزیر آغا نے لکھا ہے کہ:

> ''غزل کے شعر کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کسی ایک نکتہ کو اجاگر کیا جاتا ہے، لیکن اس کے تمام تر پہلوؤں کو ناظر کے فکر و ادراک کے لیے نامکمل صورت میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔'' (ڈاکٹر وزیر آغا، خیال پارے، ص ۱۳:)

بالفاظ دیگر جس طرح غزل کا شعر ایک غیر مکمل صورت حال کو سامنے لاتا ہے اسی طرح انشائیہ بھی شے یا مظہر کے چند گوشوں کی ہی رونمائی کرتا ہے اور اس کے بہت سے پہلو تشنۂ تکمیل رہ جاتے ہیں۔ یہ نامکمل زاویے ہی قاری کی فکر کو مہمیز لگاتے اور اس کے رہوار خیال کو نئے جادوں کی سفر پیمائی پر آمادہ کرتے ہیں۔

انشائیہ کی زبان:

انشائیہ نگاری رچی ہوئی شائستہ زبان کا عمل ہے۔ انشائیہ چونکہ خیال کی لطیف صورت اور جذبے کی سبک کیفیت کو پیش کرتا ہے اس لیے کمزور یا سپاٹ زبان اسے مناسب معاونت فراہم نہیں کرتی۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے کہ:

> ''انشائیہ نویسی کی روش اس وقت وجود میں آتی ہے جب زبان ارتقا کے بعض مراحل طے کر لیتی ہے۔'' (ڈاکٹر وزیر آغا، انشائیہ کیا ہے؟، اوراق، ستمبر اکتوبر ۱۹۸۰ء، ص ۱۳۰:)

چنانچہ اردو زبان میں انشائیہ کے فروغ میں تاخیر کا ایک باعث یہ بھی ہے کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں یہ زبان گھٹنوں کے بل چل رہی تھی اپنی اس ابتدائی منزل پر اس کی نثر لطیف کیفیات اور نادر مفاہیم کو جملہ دلالتوں سے بیان کرنے سے قاصر تھی۔

مزید برآں ایک طرف تو انتظامی سطح پر انگریزی کو فوقیت حاصل تھی اور دوسری طرف سیاسی سطح پر برصغیر کی دو بڑی زبانوں کے درمیان کشیدگی اور آویزش کی فضا پیدا کر دی گئی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ اردو زبان کا فطری ارتقا مدھم پڑ گیا اور نقطہ کے نئے قرینے

سامنے نہ آسکے۔ علاوہ ازیں اس دور میں زبان کو اصلاحی اور تبلیغی مقاصد اور معاصرانہ چشمکوں کے لیے زیادہ استعمال کیا گیا جس سے اس کا کاروباری روپ تو نکھرتا چلا گیا لیکن تخلیقی روپ پوری طرح ابھر نہ سکا۔ اس دور میں جو مضامین لکھے گئے ان میں بھی اصلاحی تبلیغی یا ہجویہ انداز تو نمایاں تھا مگر ان میں زبان کی وہ لطافت اور خستگی نہیں تھی جو انشائیہ نگاری کے لیے ناگزیر ہے۔

بیسویں صدی بلاشبہ اردو زبان کے فروغ وارتقا کی صدی ہے اور اس میں سجاد انصاری رشید احمد صدیقی، نیاز فتح پوری، ل احمد، امتیاز علی تاج، پطرس بخاری اور کرشن چندر وغیرہ نے معرکے کی چیزیں تخلیق کیں اور ان میں رومانی لپک بھی موجود ہے۔ دوسری طرف اردو ادب کو انگریزی ادب سے مس کرنے کا موقعہ ملا تو زبان کی بہت سی دلالتیں سامنے آئیں۔ تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ غلامی کے ایک طویل دور نے اردو زبان کو فطری انداز میں آزادی سے پھلنے پھولنے نہیں دیا۔ چنانچہ انشائیہ کی ضرورت کو تو محسوس کیا گیا لیکن مروجہ زبان انشائیے کی مقتضیات اور اس کے محاسن کو پوری طرح گرفت میں نہ لے سکی۔

آزادی کے بعد اردو زبان نے پاکستان کے نئے ماحول میں آنکھ کھولی، اس ملک میں اسے قومی زبان کا درجہ دیا گیا تو یہ زبان پاکستانی قوم کی آرزوؤں، تمناؤں اور تخلیقی سرگرمیوں کا مظہر بھی قرار دی گئی۔ اردو کے ارتقاء کے سفر میں جو رکاوٹیں قدم قدم پر پیش آرہی تھیں وہ آہستہ آہستہ دور ہوتی چلی گئیں اور اب الفاظ کے داخل میں معانی کی جوالا کو دریافت کرنے کی سعی ہونے لگی، لفظ کے جامد خول کو توڑ ڈالا گیا، اضافتوں سے نجات حاصل کرنے اور لفظ کی مجرد صورت کو اہم قرار دینے کی کوشش کی گئی۔ اشیاء کو الٹنے پلٹنے اور ان کے باطن میں چھپے ہوئے نئے یا انوکھے زاویوں کو تلاش کرنے کا رجحان پیدا ہوا۔ مادی ضروریات کے پہلو بہ پہلو روحانی قدروں کو فروغ حاصل ہوا، ادیب نے افقی جہت میں سفر کیا تو عمودی سمت کو بھی نظر انداز کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں اس دور میں پرانی اصناف کی تجدید ہوئی وہاں بعض نئی اصناف کو آزمانے کی ضرورت بھی محسوس کر لی گئی۔ اس ضمن میں وزیر آغا کا یہ تجزیہ درست ہے کہ اس دور میں اردو زبان میں لطیف کیفیات اور مفاہیم کو گرفت میں لینے کی جو استعداد پیدا ہوئی یہی انشائیہ کے فروغ کا اصل سبب ہے۔ (ڈاکٹر وزیر آغا، انشائیہ کیا ہے؟، حوالہ ایضاً) اور اسے اردو زبان کے ارتقا کا ایک شیریں ثمر قرار دیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ یہ حقیقت بے حد معنی خیز ہے کہ بھارت میں جہاں اردو کو فطری طور پر پنپنے کا موقعہ نہیں ملا انشائیہ نگاری پوری طرح ابھر نہیں سکی، اس طرح ترقی پسند تحریک کے ادبا جو زبان کو تبلیغی مقاصد اور ادب کو نعرہ بازی کے فروغ کا وسیلہ بناتے ہیں نہ صرف انشائیہ نگاری کی صنف میں نمایاں اہمیت کی کوئی چیز پیش نہیں کر سکے بلکہ بیش تر ترقی پسند ادبا کے ہاں تو انشائیہ کو پسند کرنے کا میلان بھی عنقا ہے اور کئی ایک ادبا جو فن پارے ترقی پسند رسائل میں انشائیہ کے نام سے پیش کر رہے ہیں وہ خالص مزاحیہ اور طنزیہ مضامین ہی نظر آتے ہیں اور ان کا انشائیہ سے دور کا تعلق بھی نہیں۔ (انور سدید، پہلا پتھر (مقدمہ)، ہم ہیں مشتاق، ص ۲۵ :، مکتبہ اردو زبان، سرگودہا، ۱۹۷۰ء)

انشائیہ کی ہیئت:

انشائیہ کے فن میں یہ حقیقت بے حد دلچسپ ہے کہ اس کی سیال صورت ہر ہیئت کو آسانی سے قبول کر لیتی ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کا یہ خیال مبنی برحقیقت ہے کہ 'انشائیہ کی خارجی شکل کسی ایک تیکنیکی سانچے پر مبنی نہیں۔ (ڈاکٹر وحید قریشی، بحوالہ اختلافات، ص ۹۲ :، مکتبہ اردو زبان، سرگودہا، ۱۹۷۵ء) ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے کہ:

> ''انشائیہ کی کوئی مخصوص ہیئت نہیں۔ حتیٰ کہ یہ بھی ضروری نہیں کہ اسے لازمی طور پر مضمون کے اسلوب میں ہی لکھا جائے۔'' (ڈاکٹر وزیر آغا، دوسرا کنارہ، ص ۸۴:)

مسعود انور نے انشائیہ کی ہیئت کو ایک ایسے غبارے سے مشابہ قرار دیا ہے جس کے اندر ہوا بھری ہو تو ٹھوس نظر آتا ہے لیکن جب ہاتھ لگائیں تو احساس ہوتا ہے کہ یہ ٹھوس نہیں بلکہ لچکدار ہے۔(مسعود انور، انشائیہ کی تیکنیک، اردو زبان، انشائیہ نمبر، ۱۹۸۳ء، ص ۶۴ :) پرٹچرڈ نے لکھا ہے کہ ''انشائیہ میں زمین کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کی نلائی کی جاتی ہے لیکن اس کی کوئی مخصوص وضع نہیں۔ (P. H. Fritshard, Essays of Today, Page 12) بالفاظ دیگر ہیئت کے اعتبار سے انشائیہ کسی خاص وضع کو قبول نہیں کرتا۔ تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ نثر کے ہر فن پارے کو جس کی کوئی خارجی شکل ہو انشائیہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ فن پارہ اپنی صنف کے اعتبار سے مختلف اجزا کو ایک تکنیکی سانچے میں ڈھالتا اور ایک کل کی صورت میں مرتب کرتا ہے۔ جبکہ انشائیہ کے تمام اجزا مرکزی ڈور سے منسلک ہونے کے باوجود آزاد ہوتے ہیں، ان اجزا میں ایک لچکدار سا تعلق ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ یوں انشائیہ نگار کو پوری آزادی ہے کہ وہ موضوع کے نکھار کے لیے صرف بیانیہ پر ہی انحصار نہ کرے بلکہ اگر فن کا تقاضا اور انشائیہ کی ضرورت ہو تو افسانے کی ہیئت اور ڈرامے کی تکنیک کو بھی وسیلے کے طور پر استعمال کرے۔ مثلاً انشائیہ نگار مکالموں سے بھی کام لے سکتا ہے اور کرداروں کے حوالے سے بھی مظاہر اور اشیا کو پیش کرسکتا ہے۔ وہ مسکرانے پر آمادہ ہو تو مزاح سے استفادہ کرتا ہے اور اگر اس کا موڈ سنجیدہ ہو تو موضوع پر فکری زاویے سے بھی نظر ڈالتا ہے۔ تاہم انشائیہ نگار کا بنیادی مقصد ڈرامہ پیدا کرنا یا کہانی بیان کرنا نہیں افسانوی یا ڈرامائی عناصر انشائیے کی تکنیک میں قیمتی اجزا کا کام دے کر اس کے مزاج پر غلبہ پانے کی اجازت نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ افسانہ، ناول یا ڈرامہ اپنے موضوع، صورت واقعہ اور پلاٹ کے لحاظ سے ایک خاص وسعت کا تقاضا کرتے ہیں جبکہ انشائیہ ایک ایسی صنف ہے جس میں الفاظ کا ہوشمندانہ استعمال ایک اہم کردار ادا کرتا ہے اور اس کی عدم تکمیل اس کا حسن شمار ہوتی ہے۔

انگریزی ادب میں انشائیہ کو مختلف ہیئتوں میں لکھنے کے کامیاب تجربے کیے جا چکے ہیں، ورجینیا وولف کا انشائیہ 'پتنگے کی موت' (death of the moth) افسانوی پیرائے میں لکھا گیا ہے۔ ایلفا آف دی پلو (alpha of the plough) نے چند ایک انشائیوں میں مکالمے کی ہیئت خوبی سے استعمال کی ہے۔ جارج ہربرٹ نے کرداروں کے بیانیہ سے انشائیہ کا تاثر ابھارا ہے، چسٹرٹن کے انشائیوں میں ڈرامائی عناصر سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

ہیزلٹ کے انشائیوں میں اکثر اوقات تنقید کا اسلوب در آتا ہے۔ اردو زبان کے انشائیہ نگاروں میں سے وزیر آغا نے ہیئت کے نسبتاً زیادہ تجربے کیے ہیں، ان کے انشائیہ 'ٹھنڈا برف ہاتھ میں' افسانے کے ہیئت استعمال کی گئی ہے لیکن خوبی کی بات یہ ہے کہ انشائیہ افسانہ نہیں بنتا بلکہ انشائیہ ہی رہتا ہے۔ 'چوری سے یاری تک' میں ڈرامے کے عناصر موجود ہیں۔ انشائیہ 'لاہور' پر تمثیلی ہیئت کا گمان ہوتا ہے۔ جمیل آذر، مشتاق قمر اور غلام جیلانی اصغر نے بھی ہیئت کے متعدد تجربات کیے ہیں۔ سلیم آغا قزلباش نے نکتے کو تمثیل سے اجاگر کرنے کا انداز اپنایا ہے۔ رام لعل نابھوی ڈرامائی مکالمے کو خوبی سے استعمال میں لاتے ہیں۔ احمد جمال پاشا کے انشائیے میں مزاح کیمیائی طور پر ہیئت کا حصہ بن جاتا ہے۔ ان سب انشائیہ نگاروں نے انشائیہ کے داخلی نظام کو زیادہ اہمیت دی ہے اور خارجی ہیئت اس نظام کا جزو لاینفک نظر آتی ہے۔ چنانچہ ان ادبا کے انشائیوں سے جو مزاج سامنے آتا ہے وہ انہیں دیگر ہمہ اقسام مضامین سے ممیز و ممتاز کر دیتا ہے اور ان کے داخل سے خالص انشائیے کی ایسی مہک اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جو کسی مخصوص ہیئت کی محتاج نہیں ہے۔

انشائیہ کے موضوعات:

انشائیہ کے داخلی نظام میں موضوع کو ایسی گراں قدر اہمیت حاصل نہیں جیسی

مضمون یا مقالہ میں حاصل ہوتی ہے۔ بلاشبہ موضوع ہی وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے گرد انشائیہ نگار اپنے تصورات کے غبارے اڑاتا ہے۔ تاہم انشائیہ نگار کا ذہن اگر رسا ہے تو وہ جس موضوع کو بھی مس کرے وہ موضوع لودینے لگتا ہے۔ وجہ یہ کہ انشائیہ نگاری کے لیے ہر موضوع ایک زرخیز موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ موضوع نہ تو عظیم ہوتا ہے اور نہ حقیر، دوسری بات یہ کہ انشائیہ میں موضوع کے پہلو بہ پہلو انشائیہ نگار کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ اس کا علمی، فکری، تہذیبی رویہ اور موضوع کو برتنے کا شائستہ انداز ہی اس کے گرد ایک روشن ہالے کو حرکت میں لاتا ہے۔ چنانچہ موضوع رسمی، معمولی، پیش پا افتادہ، عام اور بار بار رگیدا ہوا بھی ہو تو ایک خوش فکر انشائیہ نگار اس کے باطن سے نور کی جوالا اور معنی کی پھلجھڑی برآمد کرسکتا ہے، اس کے برعکس موضوع نیا اور تازہ ہو لیکن اس پر اظہار خیال پٹے پٹائے، غیر تخلیقی، سپاٹ اور بدرنگ اسلوب میں کیا جائے تو موضوع اپنی تازگی اور رعنائی کھودے گا۔ چنانچہ انشائیہ نگاری میں اعلیٰ اور ادنیٰ موضوع کا اختصاص موجود نہیں، مسعود انور کا یہ خیال درست ہے کہ انشائیہ نگار موضوع کو سامنے رکھ کر جواب مضمون قسم کی چیز نہیں لکھتا... بلکہ انشائیہ نگار موضوع کو اپنی ذات کے مدار میں داخل کرتا ہے اور پھر اس کی گردش سے اس موضوع سے اپنی ذاتی وابستگی کے مختلف زاویے ابھارتا ہے۔(مسعود انور، انشائیہ کی تکنیک، اردو زبان، انشائیہ نمبر، ۱۹۸۳ء، ص ۶۳:)

دوسرے لفظوں میں اس صنف میں اصل تخلیقی عمل تو انشائیہ نگار آزماتا ہے۔ چنانچہ جن انشائیوں کو شہرۂ آفاق اہمیت حاصل ہوئی ہے انہیں علمی یا عظیم مورخ قرار دینا شاید موضوع کے ساتھ زیادتی ہے۔ دنیا کے بیشتر انشائیہ نگاروں نے اظہار خیال کے لیے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جن پر پہلے کبھی نہیں لکھا گیا تھا اور جن کا انوکھا پن قاری کو بے اختیار اپنی طرف راغب کرلیتا ہے۔ مثال کے طور پر ورجینیا وولف کا 'پتنگے کی موت' (the death of the moth)، لیہہ ہنٹ کا 'مشعل بردار' (the lantern bearers)، چسٹرٹن کا 'چاک کا ٹکڑا' (in praise of mistakes)، جے بی پریسٹلے کا 'کچھ نہ کرنا' (on doing nothing)، وزیر آغا کا 'چوری سے یاری تک'، غلام جیلانی اصغر کا 'مکان بنانا'، جمیل آذر کا 'مانگے کا سکریٹ'، کامل القادری کا 'سریش کا درخت'، محمد اسداللہ کا 'لحاف'، احمد جمال پاشا کا 'شور'، سلیم آغا قزلباش کا 'دوربین'، سلمان بٹ کا 'بدصورتی'، مشرف احمد کا 'قرض'، جان کاشمیری کا 'ایش ٹرے'، محمد اقبال انجم کا 'پلیٹ فارم'، اکبر حمیدی کا 'دوسری منزل' وغیرہ چند ایسے انشائیے ہیں جن کے موضوع کی ندرت ان کے عنوان سے ہی ظاہر ہے اور قاری کو بے اختیار اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

مونتین اگرچہ زبان وادب کا پہلا انشائیہ نگار تھا اور اس نے بعض علمی موضوعات کو مس کرنے کی کوشش بھی کی۔ تاہم اس نے بہت سے انشائیے نئے اور انوکھے موضوعات پر بھی لکھے ہیں۔ مثال کے طور پر گفتگو کا فن (on the art of conversation) 'علالت پر' (on illness)، 'جھوٹوں کے بارے میں' (on liars)، 'خوشبوؤں پر' (on saells) وغیرہ چند ایسے ہی موضوعات ہیں جنھیں نوعیت کے لحاظ سے علمی نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن مونتین نے ان معمولی موضوعات کے بعض غیر معمولی پہلوؤں کو اپنے مخصوص غیر رسمی پیرایۂ اظہار سے ابھارا اور قاری پر خیال کی ایک نئی دنیا منکشف کردی۔

واضح رہے کہ انشائیہ میں موضوع کی ندرت ہی سب کچھ نہیں بلکہ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ انشائیہ نگار نے اس موضوع کو کس انداز میں برتا ہے اور پھر کس طرح وہ موضوع کو پہلے جملے سے آخری جملے تک ریشمی تار کی طرح کھولتا اور لپیٹتا ہے۔ پیٹر ویسٹ لینڈ نے یہ بات بڑے پتے کی کہی ہے کہ ''انشائیہ نگار کا مقصد تاثیر کی تربیت و تخلیق ہے چنانچہ موضوع کو ابتدا سے اختتام تک قاری کے ذہن نشین رہنا چاہیے۔ وجہ یہ کہ سینما کی عمارت خواہ کتنی ہی خوبصورت ہو توجہ اسکرین کی طرف ہی چاہیے۔'' (پیٹر ویسٹ لینڈ، انشائیہ کیا ہے؟، مفاہیم، ادب نمبر ۱۹۸۰ء، ص ۲۶۱: ترجمہ مسعود ہاشمی)

(ماخوذ: انشائیہ اردو ادب میں، ڈاکٹر انور سید، لاہور، ۱۹۸۵ء)

○○○○

ڈاکٹر سید محمد حسنین

مقالہ اور انشائیہ نگاری

انشائیہ ادب کی ایک خاص صورت ہے یا صنف۔ ادب کے دیگر اصناف میں اس کا رشتہ مقالہ سے قریبی ہے۔ کہانوی اصناف یعنی تمثیلیہ، حکایت، داستان، ناول، ڈراما اور افسانہ اور مثنوی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ بہ اعتبارِ صنف اس کا موازنہ مقالہ سے کیا جاسکتا ہے۔

مقالے کی روح سنجیدگی اور متانت ہے، مقالہ نگار کسی امر پر سنجیدگی سے روشنی ڈالتا ہے۔ یہ روشنی صاف و شفاف ہوتی ہے۔ اس کی تیز شعاؤں سے نفسِ تحریر کے مختلف گوشے منور و نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ہم اس تحریر کو پڑھتے ہیں اور موضوعِ تحریر یا نفسِ مضمون سے اچھی خاصی واقفیت حاصل کر لیتے ہیں۔ انشائیہ نگار بھی کسی امر پر روشنی ڈالتا ہے لیکن یہ روشنی رنگا رنگ ہوتی ہے۔ اس میں دھندلکا اور برّاقی دونوں ہوتی ہیں۔ یہ روشنی ہماری توجہ کو ایک ہی راستے پر نہیں لگاتی، بلکہ یہ اسے اٹھکیلیاں کراتی ہے۔ مقالہ پڑھنے کے بعد ہم کچھ سیکھتے یا پاتے ہیں۔ ایسی بات یا ایسا خیال جس سے ہماری علمیت میں گوں ناگوں اضافہ ہوتا ہے جس سے ہماری شخصیت میں علم کی تابندگی آتی ہے۔ انشائیہ پڑھنے کے بعد ہم کوئی گم کردہ شے پا لیتے ہیں۔ ایسی شے جو روزانہ کی سادہ اور سپاٹ زندگی میں آنکھوں سے روپوش رہتی ہے۔ ایسی شے جو ٹھوس اور ناقابلِ انکار حقیقتوں میں اوجھل رہتی ہے۔

آپ جانتے ہیں یہ دنیا حیوانوں سے بھری پڑی ہے۔ اس میں شیطان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ زندگی اور خوش گوار زندگی کو، لیکن انسانوں کی حاجت ہے اور انسان کا انسان بن کر انسانیت کا انداز کرنا بڑا دشوار ہے۔ یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ انسانی قدروں کی تمیز اور پہچان کے لیے فرزانگی کی ضرورت ہے اور یہ فرزانگی تھوڑی سی حیوانیت سے بڑے مزے میں حاصل ہو جاتی ہے۔ اس مقصد کے لیے انشائیہ بہت مفید ہے۔ یہ لمحے بھر کے لیے ہمیں حیوان بنا دیتا ہے جس سے ہماری انسانیت میں چستی اور توانائی آجاتی ہے۔

مقالہ ہمیں سنجیدگی بخشتا ہے۔ اس سے ہم میں متانت، ضبط اور سلیقہ آتا ہے۔ انشائیہ ہمیں غیر سنجیدہ بناتا ہے۔ اس سے ہم میں رِندی اور آوارہ خیالی آتی ہے۔ مقالوں کی سنجیدگی اور نری سنجیدگی سے خشکی اور بے رنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس بے کیفی یا انجماد کو انشائیہ کی آوارگی یا بدمستی ہی دور کر سکتی ہے۔ مقالوں میں معنویت کا دخل رہتا ہے اور انشائیوں میں تاثرات کا۔ مقالوں کا کام فکر خیزی ہے اور انشائیوں کا کیف انگیزی۔

مقالہ نگار ایک معلمِ ادب ہوتا ہے، اس کا کام درس و تدریس ہے اس کی باتیں عالمانہ اور حکیمانہ ہوتی ہیں، وہ سنجیدہ بات کہتا ہے اور بڑی سنجیدگی سے کہتا ہے۔ اس میں متانت کے ساتھ دیانت بھی ہوتی ہے۔ اس کا شیوہ لفّاظی نہیں۔ وہ جو جانتا ہے، کہتا ہے اور جتنا جانتا ہے، سناتا ہے۔ وہ ہمیں گمراہ نہیں کرتا۔ . . انشائیہ نگار گپ باز ہوتا ہے۔ وہ غیر سنجیدہ بات کہتا ہے اور غیر سنجیدہ طریقے پر کہتا ہے۔ وہ جتنا جانتا ہے، اس سے زیادہ سناتا ہے لیکن اس کی باتیں بکواس نہیں۔ یہ مفید اور کارآمد ہوتی ہیں۔ یہ ہماری فہم و ادراک کو منجمد ہونے سے بچاتی ہیں۔ اس سے ہمارے طائرِ تخیل کو پر لگتے ہیں۔ انشائیہ نگار کی گپیں

ہماری قوتِ تمیز پر ٹھوکریں لگاتی ہیں ۔ یہ ہم پر ان تازیانوں جیسا کام کرتی ہیں جن کی نرم چوٹیں سہہ کر ہم زیادہ ہوش مند اور زیادہ چوکس ہو جاتے ہیں۔

قصہ گوئی اور انشائیہ نگاری:

انشائیہ میں قصہ گوئی کا مطلق گزر نہیں ۔ اس کی شرتیعت میں 'کہانویت' کفر ہے۔ کچھ انتظامیہ نگاروں کے یہاں یہ خیال اب بھی رائج ہے کہ انشائیہ کسی پر لطف ہلکے پھلکے قصے یا دو چار پھڑ کتے ہوئے واقعات کا بیان احسن ہے۔ یہ خیال قطعاً درست نہیں۔ نثری ادب میں یہ صنف 'مضمون' کے دائرے میں سما سکتا ہے پر کہانی کے حلقے میں جگہ نہیں پا سکتا ادب میں قصہ گوئی اور یا واقعہ نگاری کے لیے مختلف اصناف مقرر ہیں ۔ یہ اصناف کہانی کی مختلف بھر پور مکمل اور خوشنما صورتیں ہیں جن کی تشکیل و تعمیر میں فنی ضوابط و قیود کا لحاظ لازمی ہے اور جو تمثیلیہ ، حکایت ، داستان ، ناول ، ڈراما ، افسانہ اور مثنوی سے موسوم ہیں۔ کہانی لکھنے یا پڑھنے کے لیے ہمارا ان اصناف سے رجوع کرنا لازمی ہے ۔ ادب میں ان کے علاوہ کہانی یا قصہ کے لیے مزید صنفی شکل کا کوئی وجود نہیں۔

انشائیہ کہانی کی شکل قطعاً نہیں ۔ اس کی مقبولیت اور دلکشی کا سبب نہ قصہ گوئی ہے اور نہ واقعہ نگاری۔ یہ وہ صنفِ ادب ہے جو محض غیر سنجیدہ خیالات اور ذاتی تاثرات کی ترجمانی کے لیے وقف ہے ۔ کہانی یا قصہ یا واقعہ کی پیشکش کے لیے یہ صنف بالکل ناموزوں ہے ۔ اس صنف میں کہانی کو جگہ دینا گویا لوٹے میں چائے پینی یا پلانی ہے۔

روایتی طور پر کہانی کی تشکیل و تعمیر کے لیے چند اجزا کا استعمال لازمی سمجھا جاتا ہے ، ادبی اصطلاح میں یہ 'اجزائے ترکیبی'، 'اجزائے ثلاثہ' کہے جاتے ہیں ۔ (جدیدیت کے نقطۂ نظر سے اب ان اجزا کو غیر ضروری ہی نہیں ان کے استعمال کو عبث قرار دیا جاتا ہے) یہ تین اجزا پلاٹ ، کردار اور مکاں و زماں ہیں۔

انگریزی میں ان کے لیے Character, Space and Time جیسے الفاظ مستعمل ہیں۔ کہانوی اصناف کی تعمیر اجزائے ثلاثہ کے بغیر ناممکن ہے . . . انشائیہ میں مگر اجزائے ثلاثہ کا استعمال کسی حال میں بھی جائز نہیں ۔ انشائیہ کی روح تاثرات ہیں۔ غیر سنجیدگی ، ذاتی تاثرات ، کہانی کا مغز پلاٹ یا ماجرا ہے ۔ طویل یا مختصر پلاٹ ۔ انشائیہ میں خیالات کی بے ربطی اور بے ترتیبی ہوتی ہے ۔ قصہ گوئی یا واقعہ نگاری سے انشائیہ میں وہ تنظیمی وحدت پیدا ہو جاتی ہے جو اس کے لیے عیب ہوتی ہے۔ کہانی میں اس کے برعکس ، خیالات کا گزر نہیں ۔ یہاں قصہ یا واقعہ کا دخل ہے اور اس قصہ یا واقعہ میں بھی ربط ، ترتیب اور توازن اولین شرط ہے ۔ انشائیہ کی دلکشی کی اصل وجہ انتشار خیال یا ذہنی آوارگی ہے۔ کہانی کی کامیابی کا راز اس کے برخلاف ، اتحادِ خیال میں مضمر ہوتا ہے ۔ انشائیہ میں خیالات کی بوقلمونی نظر آتی ہے اور کہانی میں واقعاتی اجزا کا تنوع ملتا ہے۔

انشائیہ میں واقعہ سے مصرف لیا جا سکتا ہے مگر واقعہ نگاری جائز نہیں کی جا سکتی۔ انشائیہ نگار واقعات کے چھینٹے اڑا سکتا ہے ، واقعات کے گھروندے نہیں بنا سکتا۔ آپ جانتے ہیں ہر واقعہ میں خواہ وہ چھوٹے سے چھوٹا کیوں نہ ہو ، بے شمار ناہموار ، سالم و غیر سالم ٹکڑے ہوتے ہیں ۔ یہ ٹکڑے بے کار و مہمل نہیں کہ انفرادی طور پر ان کا کوئی وجود نہیں ، ادب میں ان کی جزوی اہمیت سے انکار مشکل ہے ۔ ان واقعاتی ننھے ننھے ٹکڑوں کو ہم عام طور پر لطیفوں اور چٹکلوں کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ ادب میں ان کا اصطلاحی نام محاظرات ہے ۔ انشائیہ میں محاظرات کی قدر و قیمت بڑی اہم ہے ۔ یہ اسی قدر اہم ہے جتنی پرتکلف دسترخوان پر انواع و اقسام کی چٹنیاں۔ محاظرات کے استعمال ، مناسب استعمال سے انشائیہ کی رنگارنگی میں اضافہ ہو جاتا ہے ۔ محاظرات سے لگے لپٹے جو نہایت خفیف و لطیف اثرات ہوتے ہیں اور ان کی ناہمواری میں جو دلکشی مگر حیرت فزا کیفیتیں ہوتی ہیں ، قلب انشائیہ میں سما کر یہ باتوں کو زیادہ شگفتہ اور زیادہ دلگیر بنا دیتی ہیں ۔ ان کے مصرف سے انشائیہ کی بہار میں بھی ایک نکھار آ جاتا ہے۔

اس صنف میں سیرت نگاری کا بھی موقع نہیں ۔ تخلیقِ شخصیت یا مرقع نگاری

انشائیہ نگار کا کام نہیں، اس مقصد کے لیے ہمارے سامنے خاکہ نگار کی ذات آتی ہے۔ انشائیہ میں شخصیت یا انفرادیت کے نقوش وجلوؤں سے کام نکالا جا سکتا ہے گر انھیں مرکزی حیثیت نہیں دی جاسکتی۔ یہ نقوش وجلوے یہاں ذیلی مقام رکھتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ کہانوی اصناف میں ایک نہایت ہی قوی مگر خفیف مادہ ہوتا ہے جسے اصطلاح میں مرکزی خیال، بنیادی خیال یعنی theme کہتے ہیں۔ ہر افسانہ، ڈراما یا ناول میں کسی نہ کسی مرکزی خیال کا ہونا ضروری ہے۔ مطالعہ سے پہلے ہم اس سے لاعلم ہوتے ہیں، مگر مطالعے کے بعد یہ ہم پر عیاں ہو جاتا ہے۔ یہ اسی بنیادی خیال کی کشش کا نتیجہ ہوتا ہے کہ کہانی کے اجزائے ثلاثہ میں ایک گہرا ربط قائم ہو جاتا ہے۔ پلاٹ، کردار اور مکاں وزماں میں اس سے ایسی اکائی پیدا ہو جاتی ہے جو مجموعی طور پر اجزا ثلاثہ کے اتحاد کا سبب بن جاتی ہے۔۔۔انشائیہ میں اس اکائی یا اتحاد کا مطلق گزر نہیں کیونکہ اس میں بنیادی خیال سے قلم کار کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ انشائیہ ذہن کی آوارہ خیالی کا نتیجہ ہوتا ہے یہ کسی بنیادی خیال کی پھولی ہوئی شکل نہیں۔ اس کی کامیابی کا راز تاثرات کا اتحاد نہیں ان کی بوقلمونی ہے۔

(ماخوذ : صنف انشائیہ اور انشائیے، ڈاکٹر سید محمد حسنین، لکھنو، بار سوم، ۱۹۷۲، ص ۱۱:)

OOOO

ڈاکٹر آدم شیخ

انشائیہ: فکر و فن

میرے شفیق استاد اردو کے مشہور محقق اور نقاد پروفیسر نجیب اشرف ندوی مرحوم نے انشائیہ سے بحث کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے ایسّے (essay) یا انشائیہ کی اتنی متنوع مختلف اور بعض اوقات متضاد تعریفیں ہوئی ہیں کہ خود انشائیہ چلا اٹھتا ہے کہ:

شد پریشاں خواب من، از کثرت تعبیر ہا

ندوی صاحب کا فرمانا سو فیصد بجا ہے۔ ایک انشائیہ پر کیا منحصر ہے ادب کی مختلف اصناف مثلاً غزل، افسانہ، ڈرامے، ناول اور آخر میں خود ادب کی کوئی حتمی اور قطعی تعریف امر محال کی حیثیت رکھتی ہے۔ مغرب میں افلاطون اور ارسطو نیز مشرق میں امام غزالی اور ابن خلدون سے لے کر ہمارے زمانے تک مختلف فلسفیوں، مفکروں، ادیبوں اور شاعروں نے اپنے اپنے زمانے میں اور اپنے اپنے انداز میں مختلف اصناف ادب کی تعریف متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں ہر تعریف اپنی جگہ پر صحیح ہے۔ لیکن

کسی بھی تعریف کو آخری یا قطعی نہیں کہا جاسکتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ زندگی کی طرح ادب بھی ایک سیال، متحرک اور ہمیشہ آگے بڑھتی رہنے والی قوت ہے۔ ادب یقیناً زندگی اور سماج کا آئینہ ہی نہیں بلکہ اس کی پیداوار (product) بھی ہے۔ چونکہ ادب کی تخلیق افراد کے ذریعہ عمل میں آتی ہے اور ہر فرد دوسرے فرد سے کسی نہ کسی حد تک اور کسی نہ کسی سطح پر مختلف ہوتا ہے۔ اس لیے ادب میں انفرادی تبدیلیوں کا پایا جانا ناگزیر ہے۔

مختصر یہ کہ دیگر اصناف ادب کی طرح انشائیہ کی صنف بھی مختلف ادوار میں نت نئی تبدیلیوں کی مظہر اور نت نئے اسالیب کی آئینہ دار نظر آتی ہے۔ فن انشائیہ کے موجد اور باوا آدم مون ٹین سے لے کر جدید دور کے مشہور مغربی انشائیہ نگار تک مثلاً چسٹرٹن اور ورجینیا ولف کے انشائیوں کا مطالعہ بعض مرکزی خصوصیات کے ساتھ ساتھ ادیبوں کے انفرادی اسالیب بیان و ذہنی کیفیتوں moods اور ردعمل کی نشان دہی کرتا ہے۔ جہاں تک اردو کا تعلق ہے، مختصر افسانہ کی طرح انشائیہ بھی خاصی نوعمر اور کم عمر صنف ادب ہے۔ پرانے لوگوں میں محمد حسین آزاد، سجاد انصاری، میر ناصر علی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی بہت سی تحریریں انشائیہ نگاری کے زمرہ میں آتی ہیں۔ ہمارے ڈاکٹر وزیر آغا، نظیر صدیقی، محمد زماں آزردہ، مشتاق قمر اور انور سدید کے یہاں انشائیہ کی طرف خصوصی شغف ملتا ہے۔ ان تمام لوگوں میں ڈاکٹر وزیر آغا کو اہمیت اس لیے حاصل ہے کہ انھوں نے اس دور میں نہ صرف زیادہ تعداد میں انشائیے لکھے ہیں بلکہ وہ صنف انشائیہ کے سب سے نظریہ ساز بھی ہیں۔ وزیر آغا خالص انشائیہ کے ماننے والے ہیں اور اس صنف کو دوسرے اصناف سے گڈمڈ کرنے کے رجحان کے سخت خلاف ہیں۔ وہ اپنے مضمون انشائیہ کی پہچان میں سرسید سے لے کر رشید احمد صدیقی، کنہیا لال کپور، کرشن چندر اور مشتاق احمد یوسفی تک انشائیہ نگار سمجھنے والے نقادوں کی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ”اصل بات یہ ہے کہ انشائیہ کی صنف اردو ادب میں تو آ گئی ہے
> لیکن تاحال اس کی پہچان کا مسئلہ کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔“

مجھے وزیر آغا کے اس خیال سے پورا اتفاق ہے کہ ہر طرح کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین پر انشائیہ کا لیبل چسپاں کرنا کوئی مناسب اور قابل قدر بات نہیں ہے، لیکن جب وزیر آغا یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اردو میں انشائیہ نگاری کی عمر دس بارہ سال سے زیادہ نہیں یعنی دوسرے لفظوں میں یہ کہ خود وزیر آغا صاحب اردو کے پہلے انشائیہ شمار ہیں تو میں خود کو پوری طرح ان سے متفق نہیں پاتا۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ دس بارہ برس پہلے تک اردو میں انشائیہ نگاری بطور تحریک موجود نہیں تھی تو سوال یہ ہے کہ کیا آج یہ فن بطور تحریک آگے بڑھ رہا ہے یا بڑھایا جا رہا ہے؟ اور کیا کسی بھی زمانے میں کوئی صنف ادب باقاعدہ تحریک کی صورت میں موجود رہی ہے؟ ظاہر ہے کہ تحریکوں کا تعلق اصناف ادب سے نہیں بلکہ ادیبوں اور شاعروں کے ذہنی رجحانات سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں سرسید کی تحریک، ترقی پسند تحریک یا جدیدیت کی تحریک کا تعلق اور دائرۂ سفر کسی ایک صنف ادب تک محدود نہیں ہے۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں ہمارے یہاں دوسری کئی جدید اصناف کی طرح انشائیہ کی صنف بھی مغرب سے آئی ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ انشائیہ کی پہچان کے سلسلے میں مزید گفتگو کرنے سے پہلے ہم مغربی انشائیہ نگاروں پر ایک سرسری نظر ڈال لیں اور یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ مغرب میں اس صنف کو کن مختلف سطحوں پر برتا گیا ہے۔ یہاں جملۂ معترضہ کے طور پر یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ صنف انشائیہ کے تعلق سے جہاں ایک طرف وزیر آغا کا متذکرہ بالا انتہا پسند نقطۂ نظر ہے اور جس کی رو سے یہ صنف ابھی اپنے سن بلوغ کو بھی نہیں پہنچی، وہیں دوسرا انتہا پسند رویہ جاوید وشسٹ کا ہے جو ملا وجہی کو اردو ادب کا سب سے پہلا انشائیہ نگار قرار دیتے ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود کہ جاوید وشسٹ نے خود جا بجا مغربی ادیبوں کے خیالات سے استفادہ کیا ہے۔ وہ اردو انشائیوں کو مغربی اصول انتقادیات کے معیار پر پرکھنے اور جانچنے کے مخالف ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ افراد کی ذہنی اپج اور تفریق مزاج کے ساتھ ساتھ سماج، ماحول، دور اور ثقافت کی

تبدیلیاں بھی اصناف ادب پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں اور انہیں تبدیلیوں نیز انھیں اثرات کے سبب بحیثیت مجموعی ادب برابر ترقی پذیر رہتا ہے اور آگے بڑھتا رہتا ہے۔

ادبیات عالم کی تاریخ کے مطالعہ سے اس حقیقت کا پتہ چل جاتا ہے کہ ہر صنف ادب انسانی تقاضوں اور معاشرتی ضرورتوں کے پیش نظر وجود میں آئی ہے۔ ظہور اسلام سے قبل کا عربی معاشرہ جسے دور جاہلیت کا معاشرہ بھی کہتے ہیں شخصیت پرستی اور بت پرستی میں یقین رکھتا تھا۔ چنانچہ فطری طور پر اس معاشرہ میں قصیدہ گوئی اور مرثیہ گوئی کو رواج اور فروغ حاصل ہوا۔ ایران کی رومان پرور اور جذباتی فضا نے 'نسب' اور 'نشیب' کو انفرادیت کا رنگ دے کر غزل کی دنیا روشن کی رزم و بزم کی کیفیتوں اور حسن و عشق کی رنگینیوں کو مثنوی کے دامن میں پناہ ملی۔ کہانیاں سننے اور سنانے کے شوق نیز فلسفیانہ شغف نے ناول کو اور پھر صنعتی انقلاب کے بعد کی عمومی عدیم الفرصتی نے مختصر افسانہ کو جنم دیا۔ رزمیہ، المیہ، فکاہیہ، تنقید، رپورتاژ، سوانح غرض کہ ہر صنف ادب کسی نہ کسی تاریخی ضرورت یا پھر مخصوص ادوار میں انفرادی اور اجتماعی رجحانات میلانات کی اختراع ہے۔ معاشرتی تبدیلیوں اور پھر ان تبدیلیوں کی وجہ سے افراد کے نجی ردعمل کی تبدیلیوں نیز ان کے توسط سے علم و ادب میں واقع ہونے والی تبدیلیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے میاں محمد شریف نے اپنی کتاب جمالیات کے تین نظریے میں لکھا ہے، معاشرہ متحجر ہو جاتا ہے، عقائد، رسمیات اور تعصبیات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے اصول و آداب زنجیر پا ہو جاتے ہیں۔ نازک حرکی، معاشرتی توازن بگڑ جاتا ہے۔ مواد نامافیہ صورت میں اور صورت تجرید میں بدل جاتی ہے۔ زندگی پر جمود طاری ہو جاتا ہے اور فن بے جان، عامیانہ اور رسمی بن جاتا ہے۔

تاہم یہ صورت حال تادیر باقی نہیں رہتی۔ زندگی میں بھی بہار و خزاں کے دور ہوتے ہیں۔ جامد معاشرے کے بطن سے انقلاب کا چشمہ ابل پڑتا ہے اور تاریخ ایک نئے موڑ پر آجاتی ہے۔ قدامت کے بت پاش پاش کر دیے جاتے ہیں، رسوم و روایات کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں۔ نئے تصورات اور بنیادی جذبات اپنی پوری تازگی کے ساتھ نمو پانے لگتے ہیں، معاشرہ سانپ کی طرح اپنی کینچلی اتار دیتا ہے اور ایک نئی روح جاگ اٹھتی ہے، پرانے اصول، اسالیب اور معیار بدل جاتے ہیں۔ آزادی کا احساس ابھرتا ہے۔ زندگی ہنگاموں اور جدوجہد سے آشنا ہو جاتی ہے۔ معاشرتی توازن متزلزل ہونے لگتا ہے۔ فنی تجربات کا آغاز ہوتا ہے جن میں بعض تجربات کامیاب اور بعض ناکام رہتے ہیں۔ (جمالیات کے تین نظریے، ص ۱۸:—۱۹)

زندگی، معاشرہ اور علوم و فنون کے بارے میں یہ عمومی تبصرہ اپنی جگہ پر صحیح ہے لیکن جہاں تک ادب کا تعلق ہے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس کی ہر صنف مختلف زبانوں میں مختلف افراد کے ہاتھوں تمام تر تبدیلیوں سے دوچار ہونے کے باوجود کچھ ایسی بنیادی خصوصیتیں رکھتی ہے جن کی بنا پر اس کی اپنی ایک الگ پہچان اور شناخت ہوتی ہے اور جن کی بنا پر اسے دوسرے اصناف ادب سے ممیز کیا جا سکتا ہے۔ پچھلے چار سو برسوں میں انشائیہ کی صنف نہ جانے کتنی تبدیلیوں سے دوچار ہوئی ہے لیکن یہ سب کچھ مواد اور اسلوب کی سطح پر ہوا ہے۔ ادبی ہیئت (literary form) کی حیثیت سے ظاہر ہے کہ ناول اور ڈرامہ کی طرح انشائیہ کی بھی کچھ بنیادی اقدار اور بنیادی خصائص ہیں۔ اب اگر کوئی شخص اس فنی ہیئت کو جبراً توڑ کر اسے دوسرے اصناف ادب سے گڈمڈ کرنے کی کوشش کرے یا پھر اسے فقیر کی جھولی سمجھ کر حسب مرضی اس میں ادھر ادھر کا سارا مال انڈیلنے کی کوشش کرے تو یہ اس کی غلطی ہے نہ کہ انشائیہ کی۔ یہاں ضرورتاً اس بات کا اعادہ کر دوں کہ ایک تو ادب کو پرکھنے کے اصول عام طور پر عالمی ہوتے ہیں، نہ کہ ملکی اور صوبائی اور دوسرے چونکہ انشائیہ کی صنف اردو میں مغرب سے آئی ہے۔ اس لیے اس کی پہچان کے لیے ہمیں مغرب سے ہی رجوع کرنا پڑے گا۔ اہم انشائیہ نگاروں اور ان کی تحریروں سے اخذ کیے گئے انشائیہ نگاری کے اہم اصولوں سے بحث کرنے سے پہلے مختصراً یہ دیکھ لینا مناسب ہوگا کہ انشائیہ کن حالات میں اور عموماً کن ذہنی کیفیات سے جنم لیتا ہے۔ انشائیہ

نگاری کا آغاز فرانس میں موٹین montaigne سے ہوا، جسے عام طور پر اس صنف کا موجداور باوا آدم کہا جاتا ہے۔ انگلستان میں یہ سلسلہ سر فرانسس بیکن سے شروع ہوتا ہے۔موٹین کے ساتھ ساتھ انشائیہ نگاری کے میدان میں بیکن کی حیثیت آج بھی ایک اہم متوازی رویہ کی حیثیت ہے۔ چارلز اسمتھ نے موٹین کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بڑے سے بڑا انشائیہ نگار بھی موٹین کے اثرات سے نہیں بچ سکتا۔ یہی بات بیکن کے بارے میں بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے۔مغرب کا کوئی بھی ایسا انشائیہ نگار نہیں ہے جو بیکن کے اثرات سے یکسر آزاد ہو۔خواہ وہ خود چارلز لیمب ہی کیوں نہ ہو۔ موٹین اور بیکن دونوں عہدوسطی کے اختتام یعنی سولہویں صدی عیسوی کی پیداوار تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغرب میں لوگوں کو اچانک یہ احساس ہوا کہ انھیں اب قدیم داستانوں، پندناموں اور رزم ناموں کی مزید ضرورت باقی نہیں رہ گئی۔اس طرح اب ادب، متعلقہ ادیب کے ذاتی غم یا خوشی یا محبت یا نفرت کا اظہار بن گیا۔ تاریخ اور داستانوں کو الگ رکھ دیا گیا اور فن کار مختلف مسائل پر خود اپنی بات کہنے کے لیے یعنی دوسرے لفظوں میں اظہار ذات کے لیے بے چین ہو اٹھا۔ essay یا فرانسیسی essais کے لغوی معنی ہوتے ہیں کوشش کرنا (totry) یا تولنا (toweigh) یہ بے چینی جو بعد میں انشائیہ کا جز ولاینفک بنی انسان کی فطرت کے زیروبم کا نتیجہ تھی جسے کوئی بھی فنی اصول یا ادبی مسلک ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پابند نہیں بنا سکتا۔

ازل سے قدرت کے طاقتور عوامل اور خود ساختہ رسوم وقوانین میں جکڑا ہوا انسان شعوری اور غیر شعوری طور پر آزادی کی ایک ایک سانس کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ انشائیوں میں دراصل فن کار کے اسی جذبۂ حریت کی تسکین ہوتی ہے۔انشائیہ کی نوعیت اور ماہیت کے پیش نظر انشائیہ نگار کو رومانی مفکر بھی کہا جاتا رہا ہے۔کیوں کہ وہ زندگی کو دماغ اور دل نیز جذبہ اور ادراک کے الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ یہاں یہ بات واضح کردوں کہ رومانویت سے یہ دھوکا نہ کھانا چاہیے کہ انشائیہ نگار محض تخیل میں پرواز کرتا ہے اور فضاؤں کی سیر کرتا ہے۔ برخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ انشائیہ نگار اڑان تو چاہے جتنی اونچی بھرے اس کے قدم ہمیشہ زمین پر مضبوطی سے ٹکے رہتے ہیں۔انشائیہ نگار اس سارے فنی عمل کو نہایت ہی نپے تلے compact انداز میں، بے تکلف طور پر اور اپنی ذات کو مرکز بنا کر کرتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ اختصار، غیر رسمی طریق کار اور انکشاف ذات انشائیہ نگاری کی اہم خصوصیات ٹھہریں۔لیکن اس سلسلہ میں ڈاکٹر وزیر آغا اعتراض کرتے ہوئے اور بڑی حد تک صحیح اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ خصوصیات کم وبیش دوسرے اصناف ادب میں بھی مل جاتی ہیں۔پھر انشائیہ کی اپنی پہچان یعنی تعریف کیا ہوئی...؟

انشائیہ کی ایک بے حد مقبول اور مشہور تعریف ہمیں ڈاکٹر جانسن کے یہاں ملتی ہے۔اس کے خیال میں:

> "is a loose solly of the mind on irrgular indigested piece not a regular and orderly constrewartion."

یعنی یہ کہ انشائیہ ایک ایسی ذہنی یا دماغی ترنگ ہے جس کے لیے کوئی مربوط فکری نظام اور ترتیب کی ضرورت نہیں اور جس کا بنیادی تعلق نسبتاً اشیاء کی اوپری سطح سے ہوتا ہے۔

ایک مخصوص حد تک یقینا جانسن کی یہ تعریف فن انشائیہ کا احاطہ کرتی ہے اور وہ اس لیے کہ جب ڈاکٹر جانسن نے انشائیہ کی یہ توضیح کی تو ان کے سامنے فطری طور پر اٹھارویں صدی تک کے انشائیے تھے گذشتہ دوسو برس میں انشائیہ کی صنف برابر تغیر پذیر اور ارتقاء پذیر رہی ہے۔ جیسا کہ پہلے میں اشارہ کر چکا ہوں شروع سے ہی فن انشائیہ دوستونوں یعنی دورویوں کے درمیان سفر کرتا رہا ہے۔ایک رویے کا تعلق موٹین سے ہے جن کے تحت انشائیہ نگار مظاہر حیات وکائنات کے تعلق سے اپنے خالص نجی اور انوکھے

تجربات یاردعمل کو ہلکے پھلکے شگفتہ انداز اور نسبتاً پر بھرے لہجے میں پیش کرتا ہے۔اسی بناء پر بعض لوگ انشائیہ کو light literature بھی کہتے ہیں۔ یہ روایت چارلز لیمب اور گولڈ اسمتھ سے ہوتی ہوئی آر ایل اسٹیونسن سے بیسوی صدی کے زبردست انشائیہ نگار بیر بوم (beer - bohm) اور پھر جدید ترین انشائیہ نگار پال جنگز (paul genning) تک پہنچتی ہے اور آج بھی بحیثیت مجموعی انشائیہ نگاری کی غالب روایت ہے۔ دوسرے رجحان کا آغاز جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں بیکن (bacon) سے شروع ہوتا ہے۔ اڈیسن اور ہیزلٹ سے ہوتا ہوا بیسویں صدی میں بیلوک (bellock) اور چسٹرٹن تک آتا ہے۔ اڈیسن نے جو بیکن اور مونٹین کی روایتوں کا بہترین مزاج داں اور موثر ترین امتزاج تھا اپنے انشائیوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) سنجیدہ انشائیے (serious essays) جن میں اولین فلسفہ، منطق، تاریخ اور تحقیق سے دامن بچاتے ہوئے پر تکلف اور عالمانہ انداز میں موت، دوستی، شادی اور تعلیم جیسے اہم مسائل پر اپنے ذاتی تاثرات کا اظہار کرتا ہے۔

(۲) لمحاتی انشائیے (occasional papers) جن میں اڈیسن بے حد بے تکلف، پر مزاح موڈ اور نجی ترنگ میں نظر آتا ہے۔

لیمب کے وہ غیر معمولی جوشیلے مداح جو اسے انگریزی کا پہلا حقیقی انشائیہ نگار قرار دیتے ہیں دراصل بھول جاتے ہیں کہ بیکن اور اس کے بعد اڈیسن نے ہی لیمب کے لیے راستہ بنایا تھا۔آج بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو محض مونٹین کے طرز تحریر کو ہی انشائیہ نگاری بھی کہتے ہیں! غالباً ایسے ہی لوگوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے سوزن کوپر (suson cooper) اپنی حالیہ کتاب 'انشائیہ نگاری کے پانچ دور' کے پیش لفظ میں لکھتی ہیں کہ "انشائیہ، نثر میں سانیٹ کا نعم البدل نہیں ہے کہ اس کی ہیئت میں کسی قسم کی تبدیلی ہی نہ ہو سکے اور جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک روایتی اور جامد ڈھانچے سے بندھا رہے۔ انشائیہ ایک ایسا فنی ڈھانچہ ہے جو زبان وادب کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ خود بھی بدلتا رہتا ہے۔ جو لوگ اس تبدیلی کو قبول نہیں کرتے ان کے یہاں ناقابل برداشت یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس طرح انشائیہ نگاری زبان وادب کی تبدیلیوں کو قبول کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا ناطہ براہ راست زندگی سے جوڑ لیتی ہے۔ ناول نگار، افسانہ نویس، محقق اور نقاد جب کچھ لکھنے بیٹھتا ہے تو اس کے سامنے واضح مقاصد ہوتے ہیں، فن پارہ کی ابتدا اور اختتام کا واضح نقشہ ہوتا ہے۔ نیز وہ اپنے قاری کو دلائل و براہین کے ذریعہ قائل کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ زندگی میں اس قسم کے کسی نظم وضبط کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں مشہور جدید امریکی انشائیہ نگار اسٹوورٹ پریٹ شرمن (stuart pratt sherman) نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ "زندگی بجائے خود ایک انشائیہ ہے۔ نہ تو کسی مخصوص نقطے سے اس کا آغاز سفر ہوتا ہے اور نہ ہی مدت سے پہلے تک اس کی طے شدہ منزل ہوتی ہے۔ انشائیہ کا راستہ ایک بہتے ہوئے دریا کی طرح ہے، جس کی رفتار کبھی بے حد تیز اور کبھی بے حد سبک اور نرم رو ہو جاتی ہے۔ یہ میدانوں میں بھی بہتا ہے اور اوبڑ کھابڑ چٹانوں کے بیچ اپنا راستہ بنا لیتا ہے۔ یہ مختلف راستے دراصل انشائیہ نگار کی وہ بدلتی ہوئی ذہنی کیفیتیں ہیں جن سے دھوپ چھاؤں والی کیفیت کا جادو پیدا ہوتا ہے۔ اپنے غیر متوقع اور غیر معین انداز کی وجہ سے ہر لحہ بدلنے والی زندگی ہو بہو انشائیہ کے مشابہ ہے۔ زندگی سے اسی مشابہت کے سبب بیسویں صدی کے اہم انشائیہ نگاروں میں سے بعض نے انشائیہ کے دامن کو وسیع کرنے نیز اسے ہم عصر زندگی کے مطابق بنانے کی وکالت اور عملی کوشش کی ہے۔ مثلاً بیلوک (bellock) نے صنف انشائیہ میں مذہبی مسائل کو اور چسٹرٹن نے اخلاقی اور معاشی مسائل کو داخل کرنے کی زبردست حمایت کی ہے۔ اس طرح اب ہم اگر قدیم وجدید انشائیہ نگاری کا مکمل احاطہ کریں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انشائیہ دراصل ایک ایسا مثلث ہے جس کا ایک زاویہ ذاتی اور خود سوانحی ہے۔ دوسرا معروضی یعنی ٹھوس حقائق بیان کرنے والا اور تیسرا تجریدی اور آفاقی۔ یہ تینوں زاویے

دراصل انشائیہ کے تین بنیادی اوصاف بیان کرتے ہیں جو یوں ہیں: (۱) نقطۂ نظر، (۲) موضوع، (۳) اسلوب۔

کامیاب ترین انشائیے وہ ہوتے ہیں جن میں کسی ایک یا دو خصوصیتوں کے بجائے تینوں خصوصیتوں کو بیک وقت اور خوسگوار تناسب کے ساتھ برتا جائے، اسی مسئلے کی اگر مزید وضاحت کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ نقطۂ نظر انشائیہ کی متعلقہ فن کار کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ انشائیہ کا موضوع خواہ کچھ بھی ہو موضوع کے برتاؤ پر ہی انشائیہ نگار کو یوں نگاہ ڈالنی چاہیے کہ پڑھنے والے اپنے آپ کو اس کے تجربے میں شریک سمجھنے کے باوجود حیرت و استعجاب میں پڑ جائیں اور یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں کہ اگر چہ انھوں نے ان اشیاء کو پہلے بھی دیکھا تھا، ان کے بارے میں پہلے بھی سوچا تھا لیکن اشیاء کا آپسی تعلق جو اس مخصوص فن پارہ میں نظر آتا ہے۔ اس تک ان کی نگاہ نہیں گئی۔ اس عمل میں انشائیہ نگار ہر تجربے کو پہلے خود حقیقت کے طور پر قبول کرتا ہے، اور پھر اپنے احساسات و جذبات کی لہروں کو مناسب ترین پیرایہ میں قاری تک منتقل کرتا ہے۔ یہ مناسب ترین پیرایہ دراصل اسلوب کا مسئلہ ہے۔ انشائیہ میں ضروری طور پر ایسا اسلوب اختیار کیا جاتا ہے کہ قاری فن کار کے ساتھ ساتھ سفر بھی کرتا رہے اور دوران سفر لطف اندوز بھی ہوتا رہے۔ انشائیہ نگاری میں شدت تاثر کا بہت کچھ دار و مدار اسلوب پر ہی ہوتا ہے۔ فرانسیسی نقاد بفن (buffon) اسلوب اور شخصیت کو جب ایک دوسرے کا آئینہ قرار دیتا ہے تو اس کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ اسلوب کے ذریعہ فنکار کی حقیقی اور انفرادی شخصیت قاری تک پہنچ سکے۔ جب ہم شخصیت کی منتقلی یا اظہار ذات کی بات کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب قطعی نہیں ہے کہ فنکار انشائیہ کے ذریعہ اپنے ذاتی مسائل و افکار یا ذاتی تعصّبات کو پیش کرے۔ یہ کام تو خود نوشت سوانح میں کیا جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ بہت سے انشائیے خود سوانحی انداز لیے ہوتے ہیں لیکن اس انداز میں متعلقہ فنکار کی خودی یا انانیت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ انشائیہ کا فن اپنے خالق سے اس کی کشید کی ہوئی distilled شخصیت کا مطالبہ کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ہمیں لیمب کے بہت سے انشائیوں میں اس کی عمومی زندگی کا دردناک پس منظر نظر آتا ہے لیکن کہیں بھی خود ترحمی یا رحم طلبی کے جذبات دکھائی نہیں دیتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انشائیہ نگار زندگی کے مقاصد اور ان کے حصول کے ذرائع سے نہیں بلکہ زندگی کی رنگا رنگی سے سروکار رکھتا ہے۔ مشہور نقاد اے سی بینسن (a. c. benson) کا خیال ہے کہ مختلف انشائیہ نگاروں کے انفرادی مزاج اور افتادِ طبع کے فرق کی وجہ سے ان کے انشائیے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن تمام انشائیوں کی روح ایک ہی رہتی ہے۔ یعنی وہ ذاتی احساس اور ذاتی تاثر جو کسی عجیب وغریب، دلچسپ، خوبصورت، انوکھے یا پر لطف واقعے، مشاہدے یا تجربے سے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام تر انشائیے استعجاب اور انبساط کی دولت سے مالا مال رہتے ہیں۔ انشائیہ نگار مزاح نویس نہیں ہوتا چونکہ استعجاب و انبساط کا تعلق ذہنی آزادروی سے ہوتا ہے۔ اس لیے انشائیہ میں فن کار کی حس مزاح زیرین لہر کے طور پر موجود رہتی ہے۔ صنف انشائیہ کی انھیں خصوصیتوں یعنی اختصار، اظہار ذات، استعجابی کیفیت، مسرت، انبساط کا اچانک تجربہ وغیرہ کی بناء پر الکزینڈر اسمتھ نے اسے غنائی شاعری سے تشبیہ دی ہے۔ ناچیز کے خیال میں انشائیہ کو شاعری نہ سمجھ کر انشائیہ ہی سمجھنا چاہیے۔ کیوں کہ اس کی اپنی ایک آزاد حیثیت اور ہیئت ہے۔

(ماخوذ: فکر و فن، ڈاکٹر آدم شیخ، اردو انشائیہ سفر منزلیں اور رہنما، ممبئی، ۱۹۸۸ء)

OOOO

مشکور حسین یاد

انشائیہ میں انکشافِ ذات

آپ جانتے ہیں انشائیہ میں انکشاف ذات کا مسئلہ اہم ترین مسئلہ ہے۔ اہم ترین اس لیے کہ انکشاف ذات کے بغیر کوئی ادیب ایک حرف تک نہیں لکھ سکتا۔ گویا انکشاف ذات کے بغیر یہی نہیں کہ ہم انشائیہ کو وجود میں نہیں لاسکتے، بلکہ پوری دنیائے ادب ہی گول ہوجاتی ہے۔ اس جمال کی تفصیل یہ ہے کہ ادیب کو ادب تخلیق کرنے کے لیے سب سے پہلے اپنی طرف دیکھنا پڑتا ہے، اس کے لیے اپنی ذات میں جھانکنا ضروری ہے، بلکہ سچ پوچھئے تو جو ادیب جس قدر گہرائی سے اپنی ذات کا مشاہدہ کرتا ہے، اسی قدر اس کی تخلیقات میں انوکھاپن، انفرادیت اور گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ گویا اپنی طرف دیکھنا یا اپنی ذات میں جھانکنا ایک ایسا پیمانہ ہے جس سے کسی ادیب کی تخلیقات کا معیار قائم ہوتا ہے۔ جدت، انفرادیت اور انوکھے پن کے تمام ڈانڈے لکھنے والے کی اپنی ذات سے نکلتے ہیں۔

مشاہدۂ کائنات کی اولین شرط مشاہدہ ذات ہے۔ جو انسان اپنی ذات کا مشاہدہ اچھی طرح نہیں کرسکتا۔ اس میں کائنات کا مشاہدہ کرنے کی صلاحیت بھی بخوبی پیدا نہیں ہوسکتی۔ انسان نے مشاہدہ کے ضمن میں معروضی اور موضوعی دو نقطہ ہائے نظر کی تقسیم تو کرلی ہے، لیکن بغور دیکھا جائے تو اس تقسیم کی حیثیت سطحی نوعیت سے کچھ زیادہ نہیں بنتی کیونکہ سچا مشاہدہ آخر میں معروضی اور موضوعی کی تقسیم کو ختم کردیتا ہے۔ اگر آپ میں اپنی ذات کے اندر جھانکنے کی جرأت وہمت ہے تو پھر آپ کائنات کے سطحی مشاہدہ پر کبھی مطمئن نہیں ہوسکتے۔ کائنات کی سطح آپ کے سامنے ہونے کے باوجود آپ کی نگاہ کو گہرائی میں اترنے کی دعوت دیتی رہتی ہے، لیکن سطح کائنات کی اس دعوت کو آپ اسی وقت محسوس کرسکتے ہیں جب کہ آپ کو اپنی ذات کے اندر دیکھنے کی بھی عادت ہو۔ اگر آپ کو اپنی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں تو یاد رکھئے آپ کائنات کی طرف بھی بھرپور نگاہ سے نہیں دیکھ سکتے۔ کائنات کا انوکھاپن بھی آپ کو اسی وقت محسوس ومعلوم ہوگا جب کہ آپ نے اپنی ذات کے انوکھے پن کو تلاش کرلیا ہوگا۔ اپنی طرف دیکھنے کا عمل کائنات کی طرف دیکھنے کے بےشمار باب وا کرتا ہے۔ مشاہدۂ ذات تو کائنات کے اسرار معلوم کرنے کی بڑی چابی ہے۔ کلید ہزار جہت کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انشائیہ نگار کے لیے پرسنل ہونا اس لیے ضروری ہے کہ وہ اس طرح پرسنل ہوکر صرف اپنی ذات کا مشاہدہ نہیں کرتا بلکہ صحیح معنی میں کائنات کے مشاہدے کا آغاز کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک انشائیہ نگار کا شخصی اظہار اس کی اپنی ذات کے لیے نہیں ہوتا۔ وہ اپنی ذات کے حوالے سے کائنات کو اس کی

اصل وسعت اور گہرائی کے ساتھ دیکھنے کی سعی کرتا ہے۔ اس لیے ہم یہ کہنے میں سوفیصد حق بجانب ہیں کہ انشائیہ نگار کا شخصی اظہار کسی صورت میں تنگ نظری یا محدود نگاہی پر محمول نہیں ہوتا۔ وہ آپ کو اپنی ذات کے حوالے سے پوری کائنات کی سیر کرانا چاہتا ہے یا کائنات کے کسی خاص گوشے کو آپ کی نگاہوں پر روشن کرنا اس کا مطلوب ومقصود ہوتا ہے۔

ممکن ہے آپ کو وقتی طور پر میری اس بات سے اتفاق نہ ہو، لیکن بہر حال حقیقت یہی ہے کہ جو چیز ایک سچے ادیب کے سامنے ہمہ وقت رہتی ہے اور جسے ہمہ وقت اس کے سامنے رہنا چاہیے وہ اس کی ذات ہے۔ اگر ادیب ایک پل کے لیے بھی اپنی ذات کو اپنی آنکھوں سے اوجھل کرتا ہے تو پوری کائنات اس کی آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو جاتی ہے۔ انشائیہ چونکہ ادب کا نقطہ آغاز ہے، اس لیے انشائیہ نگار پر یہ قدغن لگانا ازبس ضروری ہے کہ اس کی تحریروں میں یعنی انشائیوں میں اس کی ذات ہر حال میں واضح طور پر اس کے سامنے رہے۔ یہاں واضح طور کے الفاظ استعمال کرنے سے مراد یہ ہے کہ ایک عام ادیب تو کسی دوسری صورت میں بھی اپنی ذات سے کچھ وقفے کے لیے چشم پوشی کر سکتا ہے، لیکن ایک انشائیہ نگار ایسا نہیں کر سکتا یا اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے، اسے تو ہمہ وقت انکشاف ذات میں مصروف رہنا ہے۔ یہ محض اسی کی تقدیر نہیں اس کے قارئین کا بھی مقدر ہے۔

ایک عام ادیب کی نسبت انشائیہ نگار سے قارئین اس بات کی زیادہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ یعنی انشائیہ نگار انہیں اپنی ذات میں جھانکنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرے۔ دراصل وہی بات کہ قارئین انشائیہ نگار کی ذات کے حوالے سے اپنی ذات میں جھانکنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی ذات میں جھانک کر کائنات کا مشاہدہ کرنے کے لاشعوری طور پر متمنی ہوتے ہیں، کیونکہ ان کے پاس یہی ایک وسیلہ رسائی ہوتا ہے۔ عام آدمی غریب کے ساتھ یہ بھی مصیبت ہوتی ہے کہ اسے براہ راست نہ اپنی ذات میں جھانکنے کا موقع ملتا ہے اور نہ کسی عمیق انداز سے وہ کائنات کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ اس لیے وہ اس کار خیر کے لیے ادیب کے منہ کی طرف دیکھتا ہے۔ مطالعۂ ادب کے سارے امکانات اسی قسم کی توقعات سے وابستہ ہوتے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ سطور بالا میں یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی ہے کہ جیسا عام طور پر خیال کیا جاتا ہے، انشائیہ میں انشائیہ نگار کا پرسنل یعنی شخصی ہونا محدود معنی میں قطعی طور پر نہیں ہوتا اور اگر کوئی انشائیہ نگار محدود معنی میں شخصی ہوتا بھی ہے جس کی توقع ایک سچے انشائیہ نگار سے بہت ہی کم ہوتی ہے تو ہم ایسی صورت میں اگر کسی انشائیہ کو شخصی کہہ دیں تو اور بات ہے ورنہ عام طور پر ایک انشائیہ نگار اپنے انشائیہ میں عام معنی میں کبھی پرسنل یا شخصی نہیں ہوتا، البتہ یہ ضرور ہے کہ جس واضح انداز میں ایک انشائیہ نگار اپنی بات کا آغاز اپنی ذات سے کرتا ہے، اس طرح ایک عام ادیب یقیناً نہیں کرتا۔

قصہ دراصل یہ ہے کہ ایک عام ادیب کو اس طرح واضح انداز میں پرسنل ہونے کی آزادی بھی کہاں نصیب ہوتی ہے جب کہ اس طرح واضح انداز میں پرسنل ہونے کی آزادی ایک انشائیہ نگار کا بنیادی حق ہوتا ہے۔

کہنے کو یوں کوئی ہزار کہتا پھرے کہ ادیب اور شاعر لوگ زیادہ تر ہواؤں میں اڑنے کے عادی ہوتے ہیں، لیکن اس امر واقعہ سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شعر و ادب کی بنیاد ایک بے حد ٹھوس حقیقت پر قائم ہوتی ہے اور آپ جانتے ہیں وہ ٹھوس حقیقت کیا ہے؟ یہی انسان کی اپنی ذات ہر شخص کے لیے اس کی ذات سے بڑھ کر دنیا میں کوئی ٹھوس اور سنگین حقیقت نہیں۔ دنیا میں آ کر سب سے پہلے انسان اپنے آپ ہی کو سب سے بڑی حقیقت کے طور پر محسوس کرتا ہے۔ دنیا کی باقی دوسری تمام حقیقتیں اسی اپنی ذات کے حوالے سے اس کے احاطہ ادراک و احساس میں داخل ہوتی ہیں، چنانچہ جب کوئی لکھنے والا اپنی ذات کے حوالے سے کچھ لکھ رہا ہوتا ہے تو اس وقت وہ ایک نہایت ٹھوس حقیقت کو بنیاد بنا کر کچھ لکھ رہا ہوتا ہے۔ ادیبوں اور شاعروں پر خیالی فضاؤں میں ا

ڑنے کاالزام اس وقت عائد ہوتا ہے جب ان کا رشتہ اپنی ذات سے منسلک نہیں رہتا۔ لکھنے والے کے سامنے اس کی اپنی ذات قائم ودائم رہے تو وہ زندگی کے ٹھوس حقائق سے کیسے آنکھیں چرا سکتا ہے اور ظاہر ہے انشائیہ نگار سے بڑھ کر اپنی ذات کو اپنے پیش نظر رکھنے والا دوسرا کون ہوسکتا ہے؟ ہر ادیب کے بارے میں عام طور پر جو یہ کہا جاتا ہے کہ اسے کبھی نہ کبھی انشائیہ لکھنے کی طرف توجہ ضرور کرنی چاہیے تو اس کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ دیگر اصناف ادب کی پابندیوں کی وجہ سے لکھنے والے پر جو ایک تکلف کی فضا طاری ہوجاتی ہے وہ ٹوٹ جائے اور زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے اس کا رشتہ نہ صرف قائم ودائم رہے، بلکہ اس میں مزید استحکام پیدا ہو۔

فرانسیسی ادیب مون تین نے جو آخر عمر میں اپنی ذات کو واضح طور پر سامنے رکھ کر لکھنا شروع کیا تھا تو اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں تھا کہ وہ 'ایسے' کا نام دے کر کسی نئی صنف ادب کا آغاز کر رہا ہے بلکہ اس کا سیدھا سادھا مطلب یہ تھا اگر کوئی ادیب بہت ہی تازہ، نئی اور انفرادیت سے لبریز اور original باتیں ضبط تحریر میں لانا چاہتا ہے تو اس کا واحد حل یہی ہے کہ وہ اپنی ذات کو واضح طور پر سامنے رکھ لکھنا شروع کر دے۔ نئی باتوں اور جدتوں کا منبع باہر کی دنیا نہیں انسان کے اندر کی دنیا ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر شخص جس مقام پر کھڑے ہو کر زندگی کو دیکھ رہا ہوتا ہے اور محسوس کر رہا ہوتا ہے وہ مقام کسی دوسرے شخص کو نصیب نہیں ہوتا۔ اس لیے جو کچھ اس کے مشاہدہ اور احساس میں آتا ہے وہ کسی دوسرے فرد کے مشاہدہ اور احساس میں آ ہی نہیں سکتا۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہیں کہ خودنگر انسان ہی جدت طراز ہوسکتا ہے خودنگری اور جدت طرازی آپس میں اس طرح وابستہ ہیں کہ ہم انہیں ایک دوسرے سے علاحدہ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح کا تمام تر تصور بھی خودنگری کا مرہون منت ہے۔ اوریجنل بات کہنے کے لیے بھی خودنگر ہونا ضروری ہے۔ گویا تخلیقی قوتوں کے لیے بھی ہمیں اپنی ذات ہی کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں خودنگری کے ضمن میں تخلیقی قوتوں والی بات سب سے زیادہ واضح بھی ہے اور اہم ترین بھی۔ ہم جب تک انکشاف ذات نہیں کرتے اوریجنل ہو ہی نہیں سکتے اور اگر اوریجنل نہیں ہوسکتے تو صحیح معنی میں ہم کچھ تخلیق بھی نہیں کر سکتے۔ ایک سچی ادبی تخلیق انکشاف ذات کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتی خواہ وہ اپنے حلقۂ اثر کے اعتبار سے کتنی ہی دوررس کیوں نہ ہو، لہٰذا ایک انشائیہ نگار کا شخصی ہونا، اس کا اوریجنل ہونا، جدت طراز ہونا حیران کن حد تک منفرد ہونا ہے۔ وہ آپ پر اپنی ذات کا کوئی گوشہ ظاہر کر کے آپ کو محدود نہیں کرنا چاہتا، بلکہ اس کے برعکس اس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ آپ کی نگاہ میں وسعت پیدا ہو اور زندگی کے امکانات کا بھرپور انداز میں احساس کر سکیں۔

دراصل ایک انشائیہ نگار انکشاف ذات کے ذریعے اپنے پاؤں زمین پر مضبوطی کے ساتھ ٹکانا چاہتا ہے۔

(ماخوذ: انشائیہ میں انکشاف ذات، مشکور حسین یاد،
ممکنات انشائیہ، لاہور، ۱۹۸۳ء)

OOOO

ڈاکٹر سلیم اختر

انشائیہ: نفسیات کے آئینہ میں

جس طرح ہر انسان کی ایک مخصوص نفسیاتی شخصیت ہوتی ہے یعنی ایسی نفسیاتی

افتاد جو عام زندگی میں اس کے کرداری تنوع کی اساس ہی مہیا نہیں کرتی بلکہ اسے وہ persona بھی عطا کرتی ہے جس کے امداد سے کبھی وہ دوسروں کو فریب دیتا ہے تو کبھی خود کو... یوں کہ بالآخر یہی اس کا ٹریڈ مارک قرار پاتا ہے تو افراد کی مانند اصناف کی بھی ایک مخصوص نفسیاتی شخصیت ہوتی ہے۔ ایسی نفسیات جس کا تخلیق کار اور قارئین کے اعصاب واحساسات سے کبھی بالواسطہ تو کبھی بلاواسطہ تعلق کا اظہار ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر تخلیق کا شخصیت، ذہن اور اعصاب سے کوئی تعلق بنتا ہے تو پھر اس کے اظہار کی متنوع صورتوں کا بھی تخلیق کار کی شخصیت اس کے ذہن اور اس کے اعصاب سے کوئی نہ کوئی تعلق قرار پاتا ہے۔ اس بت کو کعبہ سے نسبت دور کی ہو یا نزدیک کی، لیکن نسبت ہے ضرور! اسے یوں سمجھئے کہ غزل کا انسانی نفسیات سے گہرا تعلق ہے بلکہ 'آمد' کی صورت میں تو اشعار ذہن کے نہاں خانوں سے آتے ہیں۔ قوافی سے اشعار کا سوجھنا اس ذہنی عمل کے باعث ہے جو نفسیات میں تلازم خیالات association of ideas کہلاتا ہے اسی طرح تعلّی کا بھی ایک مخصوص نرگسی مفہوم ہوتا ہے بلکہ میں تو اس حد تک جانے کو تیار ہوں کہ ہمیشہ نہیں لیکن بعض اوقات تو تخلص کا انتخاب بھی لاشعوری اثرات کا مرہون منت ہوتا ہے۔ میں اپنی دو کتابوں 'ادب اور لاشعور' (۱۹۷۶ء) اور 'تخلیق اور لاشعوری محرکات' (۱۹۸۳ء) میں اس ضمن میں مفصل لکھ چکا ہوں۔

یہ تو ہوا غزل جیسی صنف کا حال جسے ہم دروں بینی کی پیداوار بھی قرار دے سکتے ہیں لیکن اس کے برعکس خالص آورد اور تصنع کی صنف یعنی قصیدہ بھی نفسیاتی اثرات کے کلیتاً آزاد نظر نہیں آتا اور نہیں تو صرف اس بنا پر کہ خوشامد کو تخلیق کا درجہ دینے کے بعد قصدہ نگار کس طرح فن کے زعم میں تعلّی کی صورت میں شیخی بگھارتا ہے۔

الغرض! افراد کی مانند اصناف کی بھی کوئی نہ کوئی نفسیاتی اساس ضرور ہوتی ہے، لیکن جس طرح لوگوں کی اکثریت انبارمل ہوئے بغیر زندگی بسر کی جاتی ہے اسی طرح اصناف بھی تخلیقات کا بوجھ اٹھائے صدیوں کا سفر طے کر جاتی ہیں یہ احساس دلائے بغیر کہ ان کی بھی کوئی مخصوص نفسیات ہے۔

کیا انشائیہ کی بھی کوئی نفسیات ہے؟

میں نہ صرف اس سوال کا جواب اثبات میں دوں گا بلکہ اس امر پر بطور خاص زور بھی دوں گا اس لیے کہ اگر جانسن کی اس تعریف کو درست تسلیم کر لیا جائے کہ انشائیہ loose sally of mind ہے تو پھر جہاں ذہن آیا وہاں نفسیات کیوں نہ آئے گی کہ یہ تو ہے ہی ذہن کا علم! ذہن کو سمجھے بغیر ذہن کی اڑان یا ترنگ کے ثمر کا ذائقہ بھلا کیسے چکھا جا سکتا ہے۔ بلکہ مجھے تو غزل کے بعد انشائیہ کی ایک ایسی صنف نظر آتی ہے جس میں انسانی نفسیات زیادہ گہرے اور بہتر طریقہ سے اظہار پا سکتی ہے اور اسی لیے غزل کی مانند اس کے نفسیاتی مطالعہ کی بھی ضرورت ہے۔

ارنسٹ جونز نے 'ہملٹ' کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے یہ تصور پیش کیا تھا کہ مخصوص تخلیقات کے نفسیاتی مطالعہ کے ذریعہ سے خود تخلیق کار کی نفسیات کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے 'ہملٹ' کی روشنی میں خود شیکسپیئر کی شخصیت کا نفسیاتی مطالعہ کیا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ اسی انداز پر انشائیوں کے نفسیاتی تجزیہ کی روشنی می خود انشائیہ نگار کی شخصیت اور کسی حد تک اس کے کرداری محرکات اور اس کی مخصوص نفسی شناخت بھی ممکن ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی واضح کر دو کہ اسے ایک فارمولہ کی طرح سوفی صد صحیح اور درست نتائج کا باعث نہ سمجھ لیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی ذہن بہت ہوشیار ہوتا ہے اور لاشعور بے حد چالاک، اس لیے یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ انکشاف ذات کے برعکس انشائیہ سے اخفائے ذات کا کام بھی لیا جا رہا ہو ویسے بھی شاید ہر انشائیہ نگار کا ہر انشائیہ اتنا تخلیقی ہی نہ ہو اور یوں سرے سے اس میں لاشعور کا استعارہ بننے کی صلاحیت ہی نہ ہو۔ اگرچہ کچھ انشائیہ نگاروں نے بے معنی موضوعات پر خوب خوب خامہ فرسائی کی ہے۔ اس لیے ایسے پھسپھسے انشائیوں میں تو تخلیقی جوہر کی تلاش ہی بے سود ہے لیکن جن انشائیہ نگاروں کے ہاں سچی تخلیق کی چمک نظر آتی ہے۔ ان کے انشائیوں کا مطالعہ خود ان

کے خالق سے تعارف کا ایک اچھا ذریعہ ثابت ہوسکتا ہے۔

ادب شخصیت سے فرار ہے یا اس کا اظہار ہے؟

اگرچہ ٹی ایس ایلیٹ کے حوالہ سے اب یہ بحث خاصی پرانی ہو چکی ہے تاہم انشائیہ کے نفسیاتی مطالعہ کے ضمن میں یہ بحث اب بھی خاصی مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ ایلیٹ نے جو کچھ لکھا تھا ظاہر ہے کہ اس کا تعلق ایسّے سے نہیں تھا اس لیے یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ البتہ انسانی شخصیت کے حوالہ سے انشائیو کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ وہ انشائیے جو شخصیت سے فرار کا ذریعہ ہیں۔

۲۔ وہ انشائیے جو شخصیت کے اظہار کا ذریعہ ہیں۔

۳۔ وہ انشائیے جو کچھ بھی نہیں ہیں۔

ہمارے تمام انشائیے ان میں سے کسی نہ کسی شق میں آجاتے ہیں۔

اور ان میں سے بھی نمبر ۲ کا نوٹس لینے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ اتنے غیر تخلیقی اور اسی لیے اتنے سطحی ہوں گے کہ نفسیاتی مطالعہ تو گجا، ان کا تو کسی طرح کا مطالعہ بھی بے سود ہی ہوگا۔

اردو میں جن اصحاب نے انشائیہ پر اظہار خیال کیا ہے وہ سبھی انکشاف ذات کو انشائیہ کا وصف خاص تسلیم کرتے ہیں۔ اب اگر ذات (self) سے یہاں یہی مراد ہے جو بالعموم ذات سے سمجھا جاتا ہے تو یہ نفسیات بلکہ اگر ان کے فلسفیانہ اور مابعد الطبعی مفاہیم کو بھی پیش نظر رکھیں تو پھر نفسیات کے ساتھ ساتھ یہ مابعد الطبیعات کی حدود میں بھی داخل ہو جاتا ہے لیکن انشائیہ کی لطافت مابعد الطبیعات کے بوجھل مباحث کے لیے موزوں نہیں ہے اس لیے انشائیہ میں ذات صرف نفسیاتی معانی میں ہی اظہار پا سکتی ہے۔

انشائیہ میں شخصیت کا اظہار یا ذات کا انکشاف بالواسطہ طور پر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ بلاواسطہ اظہار کی صورت میں انشائیہ اپنی صنفی حدود سے نکل کر خود نوشت سوانح عمری اور ڈائری یا جرنل کی مملکت میں داخل ہو جائے گا۔ انشائیہ میں جو بھی لطافت ملتی ہے اور پھر یہ لطافت جس حظ کا باعث بنتی ہے اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ انشائیہ نگار ہر موضوع پر بات کرتا ہے مگر یوں گویا وہ کوئی بات نہیں کر رہا، ہر معاملہ میں ٹانگ اڑاتا ہے۔ مگر یوں گویا نہ کوئی مسئلہ ہے اور نہ ہی کوئی ٹانگ ہے اور دراصل اظہار کا یہ بالواسطہ طریقہ ہی اس کی شخصیت کے بالواسطہ اظہار کا باعث بنتے ہوئے صنف انشائیہ کو نفسیاتی مطالعہ کی حدود میں لے آتا ہے۔ چند مثالیں پیش ہیں:

> ”شخصیت۔۔۔ شخصیت کوئی ایسا باریک ساریشمی نقاب نہیں جسے آپ پہن لی تو چند لمحوں کے بعد آپ کو اس کے وجود کا احساس بھی باقی نہ رہے۔ شخصیت تو ایک وزنی عمامہ ہے جو ہر لحظہ آپ کو اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے اور ہر قدم پر آپ کو سربلندی کی دعوت دیتا ہے اس علمی عمامے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے پہنتے ہی آپ کو ہر شے چھوٹی اور معتبر نظر آنے لگتی ہے اور آپ خود کو ہفت اقلیم کے تاجدار محسوس کرنے لگتے ہیں۔ مزید برآں آپ کو انسانوں کا جم غفیر کیڑوں مکوڑوں کی طرح زمین کی سطح پر رینگتا ہوا دکھائی دینے لگتا ہے اور آپ کسی اونچے سنگھاسن پر بیٹھے ایک نگاہ غلط انداز سے ہر کسی ناکسی کو مسترد کرتے چلے جاتے ہیں اس سے آپ اور آپ کے بھائی بندوں کے درمیان ایک ایسی خلیج پیدا ہوتی ہے جو پھر کبھی عبور نہیں ہوسکتی۔“ (ڈبویا مجھ کو ہونے نے، ڈاکٹر وزیر آغا)

> ”میری شخصیت میں ایک درباری موجود ہے لیکن بدقسمتی سے مجھے دربار لگانا پڑتا ہے گو یہ دربار ایسا پرشکوہ نہیں بس شاہجہان کے دور زوال جیسا دربار سمجھ لیجئے یعنی ارد گرد طلبہ بیٹھے ہوں اور درمیان میں اختیار سے محروم شاہجہان، جب مغل شہنشاہ کو زوال آیا تو اسے

معلوم ہوا کہ حکومت علم کی دنیا میں بھی رہ کر کی جاسکتی ہے۔ یوں میری رائے میں سکول ماسٹر دور اقتدار کی نہیں دورِ زوال کی نشانی ہیں کچھ اسی فنا کے احساس نے ہمیں علم کی طرف راغب کر دیا اور ہم محکمۂ تعلیم میں اس طرح آ گرے جیسے غزل میں بھرتی کا مصرعہ لیکن محکمہ میں آ کر اندازہ ہوا کہ سارا کلام ہی ہماری طرح بھرتی کا ہے کسی شعر کی نوک پلک درست نہیں نہ کسی نے سنوارانہ کبھی نکھارا۔ چنانچہ طلبہ سے ہم وہی سلوک کرنے لگے جو نااہل شہنشاہ اپنی رعایا سے کرتے ہیں۔'' (تذکرہ دربار، صلاح الدین حیدر)

دیگر اصناف کے مقابلہ میں انشائیہ کی ایک اور مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بات ثابت نہیں کی جاتی صرف بات بنائی جاتی ہے۔ اس لیے انشائیہ نگار منطق و استدلال اور دلائل سے اس طرح پرہیز کرتا ہے جس طرح چھوت کے مرض میں کیا جاتا ہے۔ اس لیے وہ دوٹوک الفاظ میں مردانہ وار بات کرنے کے لیے مقابلہ میں عورت کی طرح گھما پھرا کر بات کرنا پسند کرتا ہے عورت مرد کی حسیات اور احساسات سے اپیل کرتی ہے اس لیے وہ ہمیشہ emotional زبان میں گفتگو کرتی ہے تو انشائیہ نگار بھی نسوانی انداز اپنا کر بات بناتا ہے۔ اس ضمن میں بات کرنے اور بات بنانے میں جو لطیف فرق ہے اسے ضرور ملحوظ رکھا جائے۔ اب بات بنانے میں جو انداز دلربائی ملتا ہے اسے انشائیہ کے اسلوب کی لطافت اور اظہار کی کوملتا کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔

انشائیہ نگار نے کیونکر منطیقانہ استدلال کے مطابق بات نہیں کرنی اس لیے وہ بات بنانے کی خاطر بات میں سے بات پیدا کرتا جاتا ہے۔ بات میں سے بات پیدا کرنا دراصل ذہن کے اس نفسیاتی عمل کے باعث ممکن ہوتا ہے جسے تلازم خیال کہا جاتا ہے یعنی دیپ سے دیپ روشن ہونے کی مانند خیال سے خیال کی لو پھوٹتی ہے اور یوں غیر محسوس طور پر بات کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے اور یہ تمام عمل کیونکہ استدلال کی مدد کے بغیر ہوتا ہے اس لیے انشائیہ نگار کا اگر کوئی 'استدلال' بنتا ہے تو وہ صرف قاری کے لطیف احساسات سے فن کارانہ چھیڑ چھاڑ ہوتی ہے اور بس اور اسی کو ہم 'انشائی استدلال' کا نام دے سکتے ہیں کہ یہ انداز استدلال صرف انشائیہ ہی سے مخصوص نظر آتا ہے۔ شاعری میں اس کے متوازی ہمیں جو 'شاعرانہ منطق' ملتی ہے اسے صنف حسن تعلیل کا نام دیا گیا ہے۔ یعنی شاعر تاریخ، جغرافیہ، عقل عامہ اور عام مشاہدہ سے قطع نظر اپنی ایک ایسی جذباتی دلیل دلاتا ہے جس سے ایک طرف اگر حسن بیان میں اضافہ ہوتا ہے تو دوسری طرف یہ شاعرانہ منطق قاری کے احساسات کو تموج آشنا کر دیتی ہے مثالیں ملاحظہ ہوں:

''سارا مسئلہ مثالی لمحہ کو زندہ رکھنا اور اسے دوام بخشنا ہے لمحہ خیال کی صورت میں پیدا ہوتا ہے اور خون بن کر رگ و پے میں دوڑنے لگتا ہے۔ ہزار مثالی ہونے کے باوجود لمحہ اس حد تک حقیقت بھی بن جاتا ہے کہ ہم اسے مکمل طور پر محسوس کر لیتے ہیں اسی حالت میں ہمیں لمحے کا ادراک ذہن کے ذریعے نہیں بلکہ حواس کے ذریعہ ہوتا ہے۔'' (لمحے کا دوام، مشکور حسین یاد)

''بدصورتی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس کی وجہ سے خوبصورت اشیاء کی پہچان ہوتی ہے۔ سوچئے کہ اگر اندھیری رات نہ ہوتی تو چاندنی رات کی قدر کون کرتا۔ گویا چاندنی رات کا تمام حسن اندھیری رات کی وجہ سے ہے بالکل اسی طرح خوبصورت اشیاء کی تمام تر خوبصورتی اشیاء کی تمام تر خوبصورتی کا راز بدصورت اشیاء میں ہے اگر بدصورت چیزیں نہ ہوں تو خوبصورت اشیاء بے توقیر ہو کر رہ جائیں۔'' (بدصورتی، سلمان بٹ)

''انسانوں کی طرح الفاظ کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ بعض انتہائی شریف اور بے ضرر ہوتے ہیں جن کا نام زبان پر آتے ہی مٹھاس

چھیل جاتی ہے بعض بے نقطہ اور بعض نکتہ دوں، بعض الفاظ ہر خاموش لیکن تہہ در تہہ ہوتے ہیں اور بعض چلبلے کہ وہ ہرایک کولذت بخشتے ہیں گویا لفظوں کی ایک قوس قزح ہے جس نے کائنات میں رنگوں کا جال بن رکھا ہے۔ مختلف انسان اپنی شخصیت اورسوچ کے مطابق الفاظ کا چناؤ کرتے ہیں بعض لوگ اپنے خاموش جذبوں کوالفاظ کے آہنگ سے محفوظ رکھتے ہیں اور بعض باتونی قسم کے لوگ اپنا ذخیرۂ الفاظ یوں استعمال کرتے ہیں جیسے گرمیوں کا سورج اپنی کرنیں لٹاتا ہے۔'' (الفاظ، محمد اقبال انجم)

ان مثالوں سے اتنا تو یقیناواضح ہوجاتا ہے کہ یہ انشائیہ نگار جذبات کی انگیخت نہیں چاہتے اس لیے انھوں نے سستی، جذباتیت اور ہیجان انگیز فقرات سے گریز کیا ہے بس سیدھے بھاؤ میں بات کی ہے۔

میں نے انشائیہ کی نفسیات کے ضمن میں ایک مضمون لکھا تھا 'انشائیہ اور انسانی سائیکی' (ادب اور لاشعور ۱۹۷۶ء) سو اس موقع پر اس سے متعلقہ اقتباسات پیش ہیں۔

''انشائیہ دراصل مہذب ذہن کی ترجمانی کا نام ہے، اسے مہذب معاشرے میں لکھا جاسکتا اور اس سے مہذب قاری لطف اندوز ہوتا ہے۔ جملہ اصناف ادب سے ہر ذہنی سطح کا قاری بقدر ہمت اوست لطف اندوزی کی اہلیت رکھتا ہے لیکن انشائیہ ہر ذہن کے لیے نہیں ہے یہ تو بالغ ذہن کے حامل مرد کے لیے ہے! جی ہاں! انشائیہ عورتوں کے لیے بھی نہیں اس لیے کہ ان کی جذباتی ساخت اور ہیجانی نظام کچھ ایسا ہوتا ہے کہ وہ ٹھہرے پانی کے طوفان ایسی کیفیت پیدا کرنے والے انشائیہ کے لیے ناموزوں ثابت ہوتی ہیں۔ ادب سے عورت کے بالعموم کچھ مخصوص قسم کے نفسیاتی تقاضے ہوتے ہیں جن میں vicarious نفسی تسکین سرفہرست ہے۔ وہ جذباتی الجھنوں کی شکار ناول کی ہیروئن کے جذباتی المیوں کی دھار میں ناؤ بن کر ڈوب ڈوب کر ابھر سکتی ہے۔ ہیروئن کی ساتھ مل مرگ دل پر نوحہ کناں بھی ہوسکتی ہے لیکن انشائیہ کی مہذب فضا اور لطافت سے لطف اندوزی اس کے تنے ہوئے اعصاب کے بس کا روگ نہیں۔ عورت کا عام زندگی کے بارے میں رویہ کیونکر بالعموم emotional ہوتا ہے اس لیے ادب کے بارے میں بھی اس کا یہی رویہ قرار پاتا ہے اس لحاظ سے اسے نیم متمدن یا نیم وحشی سے مماثل قرار دیا جاسکتا ہے جو کہانی، گیت، رقص سبھی سے اپنے اعصابی تناؤ میں کمی کرتا ہے۔ شاید اسی لیے (کم ازکم اردو میں تو) قابل ذکر انشائیہ نگار خواتین نہیں ملتیں اور یہ کتنی عجیب بات ہے کہ فکر اور ہیئت کے لحاظ سے انشائیہ نسائی لطافت کا حامل نظر آتا ہے۔ کسی شوخ یا چنچل عورت کا نہیں بلکہ متین عورت کی گفتگو ایسا دلکش لہجہ! مردانہ بلند آہنگی نہیں بلکہ نسائی دھیما پن!! انشائیہ میں خشک ذہن کا سنگلاخ استدلال نہیں بلکہ کومل ذہن کی نرماہٹ ملتی ہے اور کسی اکھڑ مرد کی طرح لٹھ مار کر زبردستی کی بجائے پیار سے اور چمکار پکار کر بات منوائی جاتی ہے۔ بات سمجھانے کے لیے دو جمع دو برابر چار کا انداز اپنانے کے برعکس خالص نسوانی انداز میں تبسم زیرلب سے ایسے لطف اشارات کیے جاتے ہیں کہ 'مرد' سب کچھ سمجھنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

... کہیں یہ تو نہیں کہ انشائیہ سے مرد اپنی 'نسائیت' project کرتا ہے۔

انسانی شخصیت کے تجزیاتی مطالعہ کے بعد ژنگ اس نتیجہ پر پہنچا کر مرد میں نسوانی اور عورت میں مردانہ رجحانات ملتے ہیں جنھیں ہم 'نسوانی روح' (anima) اور مردانہ روح (animus) کہہ سکتے ہیں۔ سو اس کے بقول:

''ہر مرد اپنے بطون میں عورت کا لازوال تصور رکھتا ہے۔ یہ تصور کسی مخصوص نسوانی پیکر سے وابستہ نہیں ہوتا بلکہ یہ خود نسوانیت کا تصور ہے یہ بنیادی طور پر لاشعوری ہوتا ہے تو کسی حد تک نسلی وراثتی اثرات کا مرہون منت ہے۔ یوں یہ مردانہ زیست کے نظام میں بنیادی نقش کی حیثیت رکھتا ہے۔'' (I. C. G. Jung,

Contribution to Analytical Psychology, P. 199)

اس نظریہ کی رو سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مرد اپنی 'نسوانی روح' کی پرداخت اور نشو ونما سے اپنی فطرت کی سخت کوشی کو نرم بنا کر کثافت کو لطافت میں تبدیل کرتا ہے۔ مہذب بننے کے عمل کو بھی اسی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اپنی خالص صورت میں مرد جارحیت پسند اور تسخیر پسند ہوتا ہے۔ مثالی مرد کا جسم ہی نہیں بلکہ ذہن بھی قوت کا مظہر ہوتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے نسوانی رواح نمایاں تر ہوتی جائے گی اس کی سخت پسندی کوملتا میں اور جارحیت مفاہمت میں تبدیل ہوتی جائے گی۔ ان دونوں کے خوسگوار امتزاج سے طبیعت کی وہ خصوصیت جنم لیتی ہے۔ جسے 'گنگا جمنی' ایسے الفاظ سے واضح کیا جاتا ہے جب کہ برعکس صورت میں اگر ماحول، سماج یا نظریۂ حیات کی بناء پر نسوانی روح ضرورت سے زیادہ غلبہ پالے تو نسوانیت کے منفی اثرات، مردانہ روح پر غالب آ کر انفرادی طور پر مرد ہی کو نہیں بلکہ پورے معاشرہ کو متاثر کرتے ہیں اس ضمن میں لکھنو کی مثال دی جاسکتی ہے جن کی نسوانیت ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ (یہ بحث موضوع کی حدود سے خارج ہے ورنہ اس نقطۂ نظر سے معاشرہ کا مطالعہ بے حد دلچسپ ثابت ہوسکتا ہے۔)

انشائیہ نگار انشائیہ لکھ کر اپنی سائیکی کے اس پہلو کو سامنے لاتا ہے جسے نسوانی روح سے تعبیر کیا جاچکا ہے۔ اس لحاظ سے اس کا مقصد کسی نکتہ کی وضاحت یا نظریہ کی صراحت نہیں۔ نہ وہ کسی امر کی شعوری طور سے تردید کرتا ہے اور نہ ہی تائید، وہ تو لطیف انداز اپنا کر اپنے قاری کی اسی نسوانی روح سے خطاب کرتا ہے۔ جسے شعوری طور سے دبانے کی کوشش کی جاتی ہے اسی لیے انشائیہ نگار معلم کی مانند تعلیم نہیں دیتا اور نہ سائنس دان کی مانند نامعلوم سے معلوم کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ صرف نئے زاویوں سے کام لے کر 'غمزۂ غماز' سے چونکانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ جھنجھوڑتا نہیں بلکہ سرگوشی کرتا ہے اس لیے گراں گوش قاری پر اس کا اثر نہیں ہوتا اور اسی لیے مہذب ذہن کی شرط عائد کی تھی۔

عام زندگی میں ہم لوگ نقلی چہرے (persona) سجائے پھرتے ہیں۔ مرد بننے کے لیے نہیں بلکہ نسوانی روح کو چھپانے کے لیے! انشائیہ اس نقلی چہرہ کو ہٹانے کی ایک کوشش لطیف ہے۔

''قابل ذکر انشائیہ نگار خواتین نہیں ملتیں...'' اردو ہی نہیں بلکہ انگریزی میں بھی کچھ ایسی ہی صورت نظر آتی ہے۔ انگریزی میں جن چند خواتین نے ایسّے کی طرف توجہ دی ان میں سے ورجینا وولف سرفہرست نظر آتی ہے جس کے قلم سے on buying a pencil, how to read a book اور the death of the moth جیسے ایسز نے جنم لیا۔ اردو نثر کی تاریخ میں غالباً ایک بھی ایسی خاتون قلم کار نہ ملے گی جسے ہم صحیح معنوں میں انشائیہ نگار قرار دے سکیں یعنی ایسی خاتون جس کا باعث شہرت ہی انشائیہ ہو۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی مرتبہ 'اردو کا بہترین انشائی ادب' میں 'انشائے لطیف' کے سلسلہ میں ۲۷ مرد قلم کاروں میں خاتون اکرم، حجاب امتیاز علی اور آنسہ محمودہ رضویہ کی صورت میں صرف تین خواتین کے اسماء ملتے ہیں جبکہ سید محمد حسنین عظیم آبادی، ڈاکٹر آدم شیخ، صفی مرتضیٰ اور ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی کے مرتبہ انشائیوں کے انتخاب میں ایک بھی خاتون انشائیہ نگار شامل نہیں۔ تو اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ وہ شاعری، فکشن اور تنقید و تحقیق سب میں مرد کے شانہ بشانہ نظر آتی ہے مگر انشائیہ کا میدان اس نے مردوں کے لیے خالی چھوڑ دیا حالانکہ اظہار و اسلوب کے لحاظ سے خواتین کے لیے انشائیہ نگاری سہل ثابت ہونی چاہیے۔

گزشتہ سطور میں دیے گئے نفسیاتی استدلال کو ملحوظ رکھنے پر تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ مرد تو انشائیہ کے ذریعہ سے اپنی سائیکی میں نسوانیت کے گوشہ یعنی اینما کو منظر عام پر لاتا ہے تو اس کے لیے انشائیہ نگاری سہل ہے جبکہ عورت کو اس ضمن میں اعمال کی دو جہات طے کرنا پڑتی ہیں وہ تولید سے اپنی نسوانیت کا اثبات کرسکتی ہے اس لیے وہ تخلیق سے اپنی سائیکی کے مردانہ رخ کو بے نقاب کرتی ہے۔ لہٰذا انشائیہ اس کی قلمرو سے باہر رہتا ہے۔ عورت عمر بھر شعوری یا غیر شعوری طور پر مرد کی برابری یا مرد کی پسندیدگی

یا پھر مردگریزی کی نفسیاتی الجھن میں مبتلا رہتی ہے اگرچہ اس الجھن اور اس سے وابستہ ردعمل کے متنوع انداز کا نفسیاتی مطالعہ خاصہ دلچسپ ثابت ہوسکتا ہے لیکن یہ سب ہمارے موضوع کی حدود سے باہر ہے۔ اس لیے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ خود عورتیں ہی اس کا جواب دیں کہ وہ انشائیہ کیوں نہیں لکھتیں؟ معاصر ادب میں سے مجھے جو دو تین مثالیں ملیں وہ پیش کرتا ہوں:

"مگر ہوا یوں کہ جب میں نے سچ بولنا چاہا تو میرے بچپن کا پرانا بیری میرا خوف جاگ پڑا۔ میں آخر کیوں لکھوں کہ لوگ کیا سوچتے ہیں۔ خلق خدا کیا کہتی ہے۔ عدم تحفظ کا احساس کیوں عام ہے۔ ذاتی مفاد کی ہولی کیسے کھیلی جا رہی ہے۔ میں کیوں لکھوں کہ بادشاہوں کی پرانی کہانیوں کے مشیر اب بھی زندہ ہیں اور وہ جیل خانے کے پہرہ دار کی طرح 'سب سے اچھا' کی رٹ لگا رہے ہیں انہیں نہیں معلوم کہ کون سا مجرم نقب لگانے کی سوچ رہا ہے اور کون سا بے گناہ نا کردہ گناہوں پر آنسو بہا رہا ہے۔ سب اچھا ہے... سب اچھا ہے!" (سب سے اچھا ہے، خدیجہ مستور)

"امید انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتی سارے دروازے بند کر کے بھی پروا کی امید رہتی ہے۔ معجزے رونما ہوا کرتے ہیں۔ انسان ان کا انتظار کرتا ہے اور اسی انتظار میں بھٹکتا رہتا ہے وہ خدا سے یہ تو پوچھ سکتا ہے کہ خدایا تو نے چاند اور دوسرے سیارے بنائے جو مدت سے اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں اور یہ تیرے وجود کا ثبوت بھی ہیں مگر کیا میں ان سیاروں سے کمتر ہوں؟ آخر یہ بھی تو تیرے اختیار میں ہے کہ تو مجھے مدار میں چلا سکے۔ میں تو ایک بے بس ہوں۔ نہ اپنے بس میں نہ کسی اور کے۔" (بے بس، لبنیٰ دائیں)

"ایک ایسے شخص کا تصور کیجئے جو صحرائے اعظم میں کھڑا اس بات پر کف افسوس مل رہا ہو کہ اس کے پاس اپنے ساعت پیما کے لیے ریت نہیں یا ایک ایسے شریف آدمی کا تصور کیجئے، جو سمندر کے عین درمیان میں یہ سوچ رہا ہو کہ کاش وہ کیمیائی تجربات کے لیے اپنے ساتھ نمکین پانی بھی لایا ہوتا۔ میں تو سفید چاک کے عظیم الشان انبار پر دھرنا مارے بیٹھا تھا۔ ساری لینڈ سکیپ سفید چاک کی بنی ہوئی تھی۔ سفید چاک کے انبار میلوں تک جمع ہوتے چلے گئے تھے حتیٰ کہ وہ آسمان کو چھونے لگے تھے میں رک گیا اور میں نے اسی چٹان سے ایک ٹکڑا توڑ لیا جس پر میں بیٹھا ہوا تھا اس نے اتنا عمدہ نشان تو نہ بنایا جتنا دکان کا چاک بناتا ہے لیکن اس نے تاثر سا ضرور مہیا کر دیا اور اب میں مسرت کی نیم مدہوش کیفیت میں اسیر کھڑا تھا، مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ سارے کا سارا جنوبی انگلستان ایک بہت بڑا جزیزہ نما روایت اور تہذیب ہی نہیں چاک کا ایک ٹکڑا بھی ہے اور یہ چیز اس کے باقی جملہ اوصاف سے کہیں زیادہ دلفریب ہے۔"
(چاک کا ٹکڑا، وقار النساء آغاز، ترجمہ جی کے چیسٹرٹن)

یہ تو وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ ہر انشائیہ کا محرک نرگسیت ہی بنتی ہے یا یہ کہ ہر انشائیہ نثری تعلّی ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ہر انشائیہ میں 'میں' بہت نمایاں ہوتی ہے بلکہ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا انشائیہ کی صنف کی اساس ہی 'میں' پر استوار ہے ایسی اور کوئی ادبی صنف نہ ملے گی جو سر تا سر واحد متکلم کے اسلوب میں اظہار پوتی ہو۔ چند مثالیں پیش ہیں:

"اللہ والوں کے نزدیک تو یہ دنیا ہی ایک امتحان گاہ ہے۔ لیکن چونکہ میرا شمار واللہ والوں میں نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے اس لیے

امتحان گاہ سے میری مراد دنیا نہیں بلکہ وہ جگہ یا کمرہ ہے جہاں طلبہ امتحان دیتے اور اساتذہ امتحان لیتے ہیں پہلے میں امتحان دینے سے ڈرتا تھا اب امتحان لینے سے ڈرتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ امتحان میں نہ صرف طلبہ کے علم کی آزمائش ہوتی ہے بلکہ اساتذہ کے صبر کی بھی!'' (امتحان گاہ، نظیر صدیقی)

''مجھے خود اس بات کا اعتراف کرنے میں چنداں مضائقہ نہیں کہ میں عمر عزیز کی یوں سیڑھیاں چڑھنے کے باوجود ذہنی طور پر وہیں کھڑا ہوں جہاں الف آم اور ب بکری کے زمانے میں تھا۔ آپ شاید اسے میرا المیہ قرار دیں لیکن دراصل یہی تو میرا طربیہ ہے کہ زندگی کی دلخراش حقیقتوں کو بچے کی غیر ذمہ دارانہ آنکھ سے دیکھتا ہوں اور اپنی ذات کے سفید ریش رخ کی حماقت پر مسکراتا ہی نہیں بلکہ قہقہے بھی لگاتا ہوں میری کوشش یہی ہے کہ میں اپنی طغولیت کو خدا کے پاس محفوظ حالت میں لے جاؤں تاکہ اسے میرے بڑھاپے کی حماقتوں کا پتہ بھی نہ چلے آپ بھی کوشش کریں کیا مضائقہ ہے؟''
(بچہ اور باپ، غلام جیلانی اصغر)

''روپیہ کی ضرورت محسوس کرتے وقت مجھے یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ میں روپیہ بنانے کے طریقوں پر نہیں اٹھایا گیا بلکہ مجھے وہ طریقے سکھائے گئے اور ان طریقوں میں مشق میں رچ گیا جو روپیہ بنانے کے قاطع ہیں میرے متضاد وہ لوگ ہیں جن کو شروع سے وہ عمل سکھائے گئے جن سے روپیہ حاصل ہو اور وہ مشق کے بعد اب اس عالم میں ہیں کہ ہر قدم پر روپیہ ان پر آ کر گرتا نظر آتا ہے یہاں ایک تیسری قسم کے لوگ بھی ہیں جو 'روپیہ روپیہ سب کچھ ہے' کہتے ہیں اور نہ ان کے پاس روپیہ ہے اور نہ وہ اس کے بنانے کے اہل ہیں۔'' (روپے کی ضرورت، محمد احسن فاروقی)

یہ ایسی مثالیں ہیں جہاں انشائیہ نگار کی 'میں' نے فن کارانہ انداز میں اظہار پایا ہے یوں کہ قاری کو 'میں' ناگوار نہیں گزرتی۔ . . ناگوار کیا؟ یہ تو ایک طرح کے حظ کا باعث بنتی ہے آپ نے دیکھا کہ ان مثالوں میں 'میں' کے اظہار میں بھی یکسانیت نہیں ملتی بلکہ اس 'میں' کی اساس اس تنوع پر استوار نظر آتی ہے جو یوں تو ہر تخلیقی شخصیت کے لیے ضروری ہے مگر انشائیہ کے لیے تو یہ اور بھی ضروری ہو جاتی ہے کہ انشائیہ نگار کے پاس اگر شخصیت کی لطافت نہیں، اگر اس کے پاس شخصیت کی گہرائی نہیں تو اس کی 'میں' انشائیہ میں بھدے طریقہ پر اظہار پائے گی جیسے اس اقتباس میں:

''پھول کی اس حیات مختصر اس کی عظیم کارکردگی سے قطع نظر کر کے جب کوئی بدمذاق اسے توڑ کر اپنے بالوں میں لگانے لگتا ہے تو میں اپنے بال نوچ لینے کی کوشش کرتا ہوں۔ جب وہ باز نہیں آتا تو اپنے سیاہ فام جادوگر کو آواز دیتا ہوں تاکہ وہ ایک ہی قہر آلود نظر سے گل چیں کے بڑھتے ہوئے ہات کو مفلوج کر دے مگر میری بدنصیبی کو عین اسی وقت میرا یہ دوست ٹاٹ کے پردے کے پیچھے خود کسی گل چیں کے بڑھتے ہوئے ہات کی زد میں ہوتا ہے. . . افسوس!!'' (یہ معصوم لوگ، ڈاکٹر وزیر آغا)

اب اس کے برعکس غالب کے خطوط سے یہ خوبصورت اقتباس ملاحظہ ہو جس کی اساس اگرچہ اس کی 'میں' پر استوار ہے لیکن اس کے باوجود 'میں' کا یہ اظہار جہاں ہمارے لیے ایک جمالیاتی تجزیہ ثابت ہوتا ہے وہاں شاید غالب کے لیے یہ کیتھارسس کا ذریعہ بھی بنا ہوگا:

''یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر، سمجھ میں نہیں

آتی، اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج وذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے جودکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں آج دور دور تک میرا جواب نہیں ہے اب تو قرض داروں کو جواب دے سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا، ہم نے ازراہ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے 'جنت آرام گاہ' و 'عرش نشیمن' خطاب دیے ہیں چونکہ یہ اپنے آپ کو شاہ قلم وسخن جانتا تھا۔ سقر مقر اور حاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے آئیے نجم الدولہ بہادر! ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ ایک قرض دار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے، اوفلاں صاحب آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے۔ کچھ تو اکسو کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروز سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا ہے۔ یہ بھی تو سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔'' (مکتوب بنام: مرزا قربان علی بیگ سالک ۱۸۶۴ء) (اوددیٔ معلیٰ، جلد دوم، حصہ اول، ص ۶۱۴:، مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل)

اس لیے اگر صلاح الدین حیدر نے یہ لکھا تو کچھ غلط نہ لکھا:

''یہ حقیقت ہے کہ غالب بنیادی طور پر شاعر یا مفکر کا نہیں بلکہ انشائیہ نگار کا مزاج رکھتے ہیں اور ان کے کئی اشعار شاعری سے کہیں زیادہ دو مصرعوں کے انشائیے کہے جاسکتے ہیں۔'' (انشائیہ کیا ہے، مطبوعہ ماہ نو رلاہور، جون ۱۹۸۴ء)

اسی لیے تو ہم کہتے ہیں کہ اچھا انشائیہ نگار بننے کے لیے انور سدید کی نہیں بلکہ شخصیت میں لطافت کی ضرورت ہوتی ہے۔

جہاں تک انشائیہ میں 'میں' کے اظہار اور اس سے وابستہ جزئیات کا تعلق ہے تو نفسیات میں اس کے اظہار کی یہ چار صورتیں ہوسکتی ہیں... شعور کی رو، تلازم خیال، فینٹسی اور خود کلامی!

اگر ہم ادبی نقطۂ نظر سے ہٹ کر شعور کی رو، تلازم خیال اور فینٹسی کا محض کلینیکل مطالعہ کریں تو ان سے وابستہ تمام ذہنی اعمال کا محرک لاشعور بنتا ہے۔ یہ لاشعور کے اظہار کے متنوع ذرائع ہیں اس لیے لاشعور کی اساس کے بغیر نہ ان کی اہمیت نہیں ہے اور نہ ہی کوئی حیثیت۔ لہٰذا تحلیل وتشریح کے بعد اپنی آخری صورت میں یہ لاشعور کی تفہیم کے استعارے قرار پاتے ہیں اس لیے اگر ان تینوں کو لیبارٹری کے معیار پر رکھ کر ان کا مطالعہ کریں اور پھر حاصل کردہ نتائج کو انشائیہ نگار کی 'میں' پر منطبق کریں تو نتائج گمراہ کن ثابت ہوں گے۔ کیونکہ انشائیہ بہر حال شعوری کاوش کا نتیجہ ہے اور اس کی 'میں' انشائیہ کی تکنیک کے لوازم میں سے ہے اس لیے صرف اس 'میں' کی بناء پر انشائیہ کو نفسیاتی معالج کے کوچ پر لٹا کر اس کی تحصیل نفسی نہیں کی جاسکتی لیکن ... اور یہ 'لیکن' بہت اہم ہے۔ تخلیق کی شعوری کاوش یا 'آورد' کے باوجود بھی انشائیہ نگار کی 'میں' کی نفسیاتی اہمیت کو یکسر ختم بھی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس 'میں' کا انداز متعین کرنے میں بالواسطہ طور پر ہی سہی شعور کی رد، تلازم خیال اور فینٹسی خاصہ اہم کردار ادا کرتے ہیں اس ضمن میں یہ بھی یاد رہے کہ گذشتہ سطور میں انشائیہ نگار کے بات سے بات پیدا کرنے کے طریقہ کی نفسیاتی اساس واضح کرتے ہوئے تلازم خیال سے اس کے تعلق کا اجاگر کیا گیا تھا۔

شعور کی رو جدید افسانہ اور ناول کی تکنیک کے اہم اجزا میں سے ہے ولیم جیمز کے اس تصور نے نفسیات کے ساتھ ساتھ جدید افسانوی ادب پر بے حد گہرے اثرات

ڈالے ہیں چنانچہ جدید افسانہ کی تکنیک پر جب بات کی جاتی ہے تو شعور کی رو کا بھی حوالہ دیا جاتا ہے۔ اردو میں قرۃ العین حیدر کے ناول 'آگ کا دریا' کی تکنیک کے ضمن میں اس کا بالخصوص ذکر کیا جاتا ہے۔ اگر اس ناول میں صدیوں کے پھیلاؤ کے پیش نظر یا شعور کی رو کا خالص نفسیاتی مفہوم ملحوظ رکھیں تو پھر تو انشائیہ نگار کی 'میں' کا شعور کی رو سے کوئی اتنا گہرا تعلق نظر نہیں آتا لیکن اگر شعور کی رو سے انشائیہ میں بات کے پھیلتے دائرے مراد لیں تو یقیناً انشائیہ میں شعور کی رو ملتی ہے لیکن اسے شعور کی بہکی ہوئی رو نہ سمجھنا چاہیے کیونکہ جب شعور کی رو بہکتی ہے تو وہ پھر آزاد تلازمہ یا فینٹسی کی صورت اختیار کر کے تخلیق کو کٹی پتنگ میں تبدیل کر دیتی ہے یا پھر انشائیہ نگار کا حال اس اناڑی پتنگ باز جیسا ہو جاتا ہے جو عین پیچ پڑنے کے موقع پر اپنی ڈور الجھا لیتا ہے، جیسا کہ تجریدی اضافہ میں کیا جاتا ہے اور جس کے نتیجہ میں افسانہ عدم ابلاغ کا شکار ہو جاتا ہے لیکن انشائیہ میں معاملہ اس کے برعکس ہے کہ وہ عدم ابلاغ کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں۔

اس ضمن میں سعد اللہ کلیم کے اس خیال سے مجھے بھی اتفاق ہے کہ 'انشائیہ میں شعور کی رو کو اس فرق اور احتیاط سے برتا جاتا ہے کہ موضوع کا مرکزی نقطہ نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے جب کہ شعور کی رو میں مقررہ موضوع اگر قدرتی انداز سے ثانوی خیالات کے ہجوم میں اوجھل ہو جاتا ہے تو اسے اوجھل ہونے دیا جاتا ہے۔۔۔ انشائیہ نگار نے اپنے قاری کی ذہنی سطح کا اتنا لحاظ ضرور رکھا ہے اسے انشائیے میں ثانوی خیالات کی بھیڑ بھاڑ کے اندر سے اصل موضوع ڈھونڈنا نہیں پڑتا موضوع سامنے رہتا ہے۔ اگرچہ دور ہوتا چلا جاتا ہے۔۔۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ خیال ایک پتنگ کی صورت کتنی ہی بلندیوں میں پرواز کر جائے مگر اس کی ڈور ہر حال میں انشائیہ نگار کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ اگر یہ بات درست ہے کہ انشائیے کی خوبیٔ شعور کی تیز روشنی میں رہنا نہیں بلکہ تحت الشعور کے دھندلکوں میں غوطہ مار کر شعور کی سطح پر ابھرنا ہے اور مجھے یہ بات قرین قیاس لگتی ہے تو پھر اس کی قربت شعور کی رو کے ساتھ اور بھی ناگزیر ہو جاتی ہے۔' (انشائیہ مقبولیت کی راہ پر؟، مطبوعہ اوراق، مارچ اپریل ۱۹۷۲ء)

تلازم خیال یا شعور کی رو جب بہک جائے اور اپنے مقصد کی راہ کو فراموش کر بیٹھے بالفاظ دیگر جب وہ تخلیق کار کے تخلیقی عمل کی گرفت سے آزاد ہو جائے تو پھر نتیجہ پریشان خیالی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے ایسی صورت میں وہ تخلیق کے کسی بھی سانچے میں فٹ نہیں ہوتی کیونکہ اب وہ فینٹسی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور اس کا اصول حقیقت یا صنف سے وابستہ تکنیک کے اصولوں یا ان عناصر کی باہمی اثر پذیری سے کوئی تعلق نہیں رہ جاتا جو اسلوب کی تشکیل کرتے ہیں ہمارے انشائیہ نگاروں نے کہیں سے جانسن کی یہ تعریف پڑھ لی کہ انشائیہ loose sally of mind ہے۔ بس اب کیا تھا ہاتھ میں ہلدی گانٹھ آ گئی اور بن بیٹھے انشائیہ کے پنساری یہ سمجھے بغیر کہ منطقی انتہا تک لے جانے کی صورت میں یہ تعریف آزاد تلازمہ، شعور کی بہکی ہوئی رو اور فینٹسی کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے۔ شاید اسی لیے ہمارے بعض انشائیہ نگاروں کے انشائیوں کے مطالعہ کے بعد یہی محسوس ہوتا ہے۔

ہر تخلیق کی طرح انشائیہ بھی اپنے وجود کے حصار سے باہر نکلنے اور ذات کے پیڈسٹل سے اونچا اٹھنے کے نفسی عمل سے عبارت ہے تخلیق اور قارئین میں نفسی رابطہ اسی سے پیدا ہوتا ہے کہ قاری اپنی مخصوص نفسی افتاد کے مطابق اس کے مطالعہ سے جہاں منفی یا مثبت اثرات قبول کرتا ہے وہاں تخلیق کار بھی (اور انشائیہ نگار کو بھی تخلیق کار سمجھ لینے میں کوئی حرج نہیں) تخلیق کے لمحات سے وابستہ نفسی کیفیات اور تخلیقی عمل کے مخصوص نفسی فوائد کو کیتھارسس کے انعام کی صورت میں حاصل کرتا ہے۔

یہ ایک عمومی اصول کے طور پر بیان کیا گیا ہے باقی رہا یہ امر کہ کسی صنف سے وابستہ تخلیقی عمل سے کس نوع کا کیتھارسس حاصل ہوگا، لمحۂ تخلیق سے جو نفسی فوائد حاصل ہوئے کیا اس لمحہ کی باز آفرینی کی صورت میں وہ دوبارہ بھی حاصل ہو سکتے ہیں اور پھر کیا ہر تخلیق کی صورت میں اس نوع کے نفسی فوائد ممکن ہیں یہ بحثیں اگرچہ بہت دلچسپ ہیں لیکن

ان کا یہ موقع نہیں لیکن عمومی اصول کے طور پر اتنا ضرور عرض کیا جا سکتا ہے کہ انشائیہ نگار اگر اپنے انشائیہ کو واقعی تخلیق بنا دیتا ہے تو پھر اس صورت میں انکشاف ذات اور ابلاغ شخصیت کی بنا پر کیتھارسس کی صورت میں اسے نفسی فوائد ضرور حاصل ہونے چاہئیں۔

اب رہی انشائیہ میں خود کلامی تو اس سلسلہ میں اساسی بات تو یہ ملحوظ رہے کہ یہ سٹیج ڈرامہ کی تکنیک کے بنیادی اجزا میں سے ہے اور aside کی مانند solilouquey بھی ڈرامہ نگار کی اس مجبوری کی بنا پر تھی کہ وہ سٹیج پر ناظرین کے سامنے کس کردار کی داخلی کیفیات، جذباتی کشمکش اور سوچ کی عملی صورت میں نہیں دکھا سکتا تھا۔ جبکہ مطالعہ کیے جانے والی اصناف کو یہ سہولت حاصل ہوتی ہے اس لیے ڈرامہ میں خود کلامی ہمیشہ نجی قسم کی چیز ثابت ہوئی تھی اور مکالمہ سے منقطع ہونے کے باعث یہ داخلی اور شخصی بن جاتی تھی۔

اس تناظر میں انشائیہ کی 'میں' کا تجزیہ کریں تو اگرچہ وہ بھی خود کلامی ہی ہے لیکن اسے ڈرامہ کی خود کلامی سے اسی بناء پر ممیز قرار دیا جانا چاہیے کہ ڈرامہ کی مانند انشائیہ میں خود کلامی اس کے عجز کے مظہر نہیں یعنی انشائیہ نگار خود کلامی کے بغیر بھی انشائیہ لکھ سکتا ہے اور اس انداز میں بہت اچھے انشائیے لکھے بھی گئے ہیں۔

بعض اوقات ناول اور افسانہ بھی واحد متکلم میں لکھا جاتا ہے لیکن وہاں افسانہ نگار کی 'میں' کو خود کلامی نہ سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ اس صورت میں وہ یا تو خود ایک کردار بن کر کہانی میں شامل ہوتا ہے اور یا پھر یہ اس خاص فن پارے کی تکنیک کا تقاضا ہوتا ہے جیسے 'امراؤ جان ادا' میں ایک 'میں' مصنف کی اور ایک 'میں' ہیروین کی! جبکہ انشائیہ کی صورت یہ ہے کہ بقول مشکور حسین یاد:

> ''اس میں صیغۂ واحد متکلم کا استعمال قریب قریب ناگزیر ہے اگر کوئی انشائیہ نگار واحد متکلم میں بات نہیں کرتا یا اس صیغے میں بات کرنا نہیں جانتا تو سمجھ لیجئے وہ انشائیہ نگار نہیں ہے۔'' (ممکنات انشائیہ، ص : 75)

یعنی وہی بات کہ انشائیہ فن کارانہ خود کلامی کا نام ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ انشائیہ کے ذریعے سے ذات کا اظہار اور شخصیت کا انکشاف بھی اسی لیے ممکن ہو پاتا ہے کہ انشائیہ کی 'میں' وہ چور دروازہ ثابت ہوتی ہے جس کے راستہ تحت الشعور کے نہاں خانوں میں کھلتے ہیں۔ یہ سہ حرفی لفظ 'میں' اپنے اندر ایسے طلسمی معانی رکھتا ہے کہ اسے ادا کرتے ہی شخصیت کے نرگسی میلانات اور انائی رجحانات پر زم کے ایک نقطہ پر مرکوز ہو جاتے ہیں یوں لطیف انداز میں ابلاغ شخصیت کی بناء پر انشائیہ نگار کیتھارسس کی صورت میں جو نفسی فوائد حاصل کرتا ہے وہ شخصیت کے منفی رجحانات اور سلبی میلانات کی تطہیر کر کے اس میں ترفع پیدا کرتے ہیں۔ یوں کہ اس کے لیے تخلیق فن بہتر سے برتر وجود کی تکمیل اور حصول کا ایک ذریعہ بن کر اسے مزید اور بہتر تخلیق کے لیے نفسیاتی طور پر تیار بھی کرتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر انشائیہ نگار انشائیہ کے تخلیقی عمل سے یہ نفسی فوائد حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے تو پھر اسے انشائیہ نگاری ترک کر کے محض ڈاکٹر وزیر آغا رہنا چاہیے کہ بقول کلیم الدین احمد:

> ''خط کی طرح انشائیہ بھی اپنی تلاش اور اپنی دریافت ہے جس میں انشائیہ نگار اپنے کردار کے پوشیدہ سرچشموں کو پالیتا ہے جس میں اس کی شخصیت کے متضاد عناصر ابھر آتے ہیں اور یہ انمل بے جوڑ اور ہم آہنگی سے عاری نظر آتی ہے وہ اپنی کمزوریوں اور خامیوں کو ابھارتا ہے اور اس طرح ان سے نجات پالیتا ہے اس کا اصل موضوع اس کی شخصیت اور اس کی آزادی ہے کیونکہ دانش مندی وہی ہے جو اپنی شخصیت کو پالے اور اپنی فطری آزادی کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔'' (نشاط خاطر از حسنین عظیم آبادی کا پیش لفظ، ص 7:)

(ماخوذ: انشائیہ نفسیات کے آئینے میں، ڈاکٹر سلیم اختر،

(انشائیہ کی بنیاد، لاہور، ۱۹۸۶ء)

OOOO

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش

انشائیے کے نقش و نگار

انشائیہ اور انشائیہ نگاری کے فن پر مختلف حوالوں سے لاتعداد مضامین لکھے جاچکے ہیں، جن سے انشائیہ کے خدوخال اور اس کے مزاج کو متعین کرنے میں بڑی مدد ملی ہے اور اب یہ پھبتی قریب قریب اپنی موت آپ مرچکی ہے کہ 'چونکہ انشائیہ' ایک نزاعی صنف نثر ہے لہٰذا اس کو پڑھنا اور سمجھنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ یہاں میں ایک دلچسپ حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ کہ پچھلے بیس سال میں جو نام انشائیہ نگاری کے افق پر طلوع ہوئے ہیں ان میں زیادہ تعداد نوجوان قلم کاروں کی ہے۔ اس کی اغلباً وجہ یہ ہے کہ نوجوان بڑی حد تک لبرل انداز فکر رکھتے ہیں، نیز انھیں خود پر پہلے سے چڑھے ہوئے کسی روایتی خول کو بھی توڑنا نہیں پڑتا۔ اس کے مقابلے میں پرانے قلم کار چونکہ مبتلائے رسوم وقیود ہیں، اس لیے شعوری طور پر اس صنف نثر کی مخالفت کرتے ہیں تا کہ ان کی 'وضعداری' کا بھرم قائم رہے۔ بہرحال بزرگ اہل قلم کے اس سخت گیر رویے سے جہاں انشائیہ کو قدم جمانے میں کافی زور آزمائی کرنا پڑی وہاں نوجوان نسل نے اسے بطور چیلنج قبول کیا اور مختصر مدت میں مضامین نو کے انبار لگادیے۔ اب اردو انشائیہ ایک ایسے 'مرکزی نقطہ' پر کھڑا ہے جس کے ایک طرف منجھے ہوئے انشائیہ نگاروں کا تجربہ ہے تو دوسری طرف نوجوان انشائیہ نگاروں کا جوش وخروش اور جب عقل اور جذبہ ایک دوسرے سے مصافحہ کرلیں تو پھر برسوں کا فاصلہ دنوں میں طے ہونے لگتا ہے، لہٰذا میں نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ اب تک انشائیہ نگاری کے ضمن میں جو مباحث ہو چکے ہیں ان کو سامنے رکھ کر انشائیہ نگاری کے فن کا اجمالی جائزہ پیش کروں تا کہ ادب کا ایک عام قاری انشائیہ کے بارے میں زیادہ وثوق سے غور وفکر کرسکے اور اس قسم کی 'بالک ہٹ' کا مظاہرہ نہ کرے جو بعض ادبی حلقوں میں اکثر دیکھنے، سننے کو ملتی ہے۔

انشائیے کی تعریف کے سلسلے میں "great essays" کے مرتب ہاوسٹن پیٹرسن یوں رقم طراز ہیں:

> ''ایسّے کا مطلب تحریر کا ایک ایسا چھوٹا سا ٹکڑا ہوگا جس میں کسی بھی موضوع سے بحث کی گئی ہو، مگر شخصی، غیر رسمی اور غیر مصنوعی انداز میں 'ایسّے' مفکرانہ ہوگا لیکن سنجیدہ نہیں، وہ فلسفے سے قریب ہوگا لیکن فلسفے کی طرح باقاعدہ نہیں اس میں ایک قسم کی ڈھیلی ڈھالی وحدت ہوگی لیکن اس میں اصل موضوع سے مسرت بخش انحراف بھی ہوگا۔ وہ ہمیں مصنف کی رائے سے اتفاق کی ترغیب دے سکتا ہے لیکن وہ ہمیں اتفاق رائے پر مجبور نہ کرے گا، 'ایسّے اسٹ' چاہے اور جو کچھ بھی ہو، وہ ہمارا دوست اور لفظوں کا فنکار ہوتا ہے۔''

اپنی اس رائے میں پیٹرسن نے نہایت خوش اسلوبی سے صنف انشائیہ کے اجزائے ترکیبی کو بیان کیا ہے، پھر یہ کہ اس تعریف میں انشائیہ نگاری کے وہ تمام بنیادی پہلو یکجا ہوگئے ہیں جن کا ہر اچھے انشائیے میں موجود ہونا ضروری ہے اور جن میں سے کسی

ایک کی عدم موجودگی سے انشائیہ کی تکمیل میں رکاوٹ پیدا ہوسکتی ہے۔ خاص طور پر یہ تعریف ان حضرات کے لیے سوچ کا وافر سامان مہیا کرتی ہے جو انشائیہ کے عناصر ترکیبی میں سے کسی ایک کو ہی تمام تر اہمیت تفویض کرتے ہیں اور یوں انشائیہ کی ہمہ گیری کو ختم کرنے کی سعی فرماتے ہیں:

''سب سے تسلی بخش essays وہ ہیں جن میں قلم کار اپنی ذات
سے لے کر کائنات تک، مجرد سے لے کر محسوس تک اور خارجی سے
لے کر باطنی دنیاؤں کے مراحل طے کر جائے۔''

آلڈس ہکسلے کے اس بیان سے یہ نتیجہ نکالنا کہ انشائیہ وحدت الوجودی یا وحدت الشہودی مزاج رکھنے والی کوئی شے ہے بالکل نا سمجھی والی بات ہوگی۔ اس بیان میں انشائیہ نگار کی وسیع المشربی اور اس کے غور وفکر کے پھیلاؤ کو واضح کیا گیا ہے، نیز یہ بتانے کی کوشش بھی کی گئی ہے کہ اگر انشائیہ نگار کی شخصیت میں عالمگیری موجزن ہو تو زمان ومکان کے فاصلے خود بخود طے ہونے لگتے ہیں۔ نیاز فتح پوری صاحب فرماتے ہیں:

''یہ ہے ایک قسم کی solioquy زیادہ تر subjective قسم
کی جسے ہم self communication بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ
ایک خاص قسم کے فکر وتصور کا نتیجہ ہے، جس میں تجزیہ جذبات،
نفسیاتی مطالعہ، منطقی استدلال، فلسفیانہ تفکر، متصوفانہ استقراء اور انشاء
عالیہ کا جمالیاتی اسلوب سب کچھ پایا جاتا ہے۔'' (اعتراف و
تعارف اردو ایسیز)

اگرچہ نیاز فتح پوری صاحب کے زمانہ میں انشائیہ نگاری کے خطوط پوری طرح اجاگر نہیں ہوئے تھے، تاہم انھوں نے انشائیہ فہمی کا اچھا مظاہرہ کیا ہے۔ خاص طور پر متصوفانہ استقراء اور فلسفیانہ تفکر کے پہلوان قلم کاروں کے لیے لمحۂ فکریہ ہیں جو انشائیے کو گڈی گڈے کا کھیل سمجھتے ہیں اور لفظی اچھل کود اور چہل کو انشائیہ کا امتیازی وصف قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ بات ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ فلسفیانہ تفکر کا مطلب افلاطون یا ارسطو کے اقوالِ زریں نہیں ہیں اور متصوفانہ استقراء کے معنی تصوف کے بارے میں کوئی علمی بحث چھیڑ کر خود کو منفرد کرنا بھی نہیں ہے بلکہ ان دونوں اصطلاحوں کا مطلب اگر pure wisdom لیا جائے تو مجھے نیاز فتح پوری صاحب کی رائے سے مکمل اتفاق ہے البتہ منطقی استدلال کا عنصر انشائیے کے مزاج کے منافی ہے گو نفسیاتی مطالعہ والی بات انشائیے کے دائرہ کار میں شامل ہے۔ احتشام حسین کا فرمانا ہے کہ:

''انشائیہ کو ایک ایسی فلسفیانہ شگفتگی کا حامل ہونا چاہیے جو پڑھنے
والوں کے ذہن میں استدلال کے ذریعے نہیں بلکہ محض خوشگوار
استعجاب اور بے ترتیب انداز بیان کے ذریعے اپنا تاثر قائم
کرے۔'' (اردو انشائیہ، مرتبہ سید صفی مرتضیٰ)

احتشام حسین صاحب کی یہ رائے بڑی دلچسپ ہے، اس میں انھوں نے استدلال انداز کو رد کرکے فلسفیانہ شگفتگی کے حوالے سے اپنی بات کو واضح کیا ہے۔ ایک اچھے انشائیے میں فلسفیانہ شگفتگی ضروری ہے جو خوشگوار استعجاب کو تحریک دے کر قاری کو غور وفکر پر مائل کر سکے۔ جہاں تک 'بے ترتیب انداز بیان' کا معاملہ ہے تو اس ضمن میں گزارش ہے کہ بے ترتیبی یعنی disorder کی اصطلاح کا جو بے محابا استعمال انشائیہ کی تکنیک کے سلسلے میں کیا گیا ہے اس نے اکثر قارئین اور بیشتر ناقدین کی سوچ کو بے ترتیب کر دیا ہے۔ وہ نجانے کیوں اس بات کو فراموش کر بیٹھے ہیں کہ بے ترتیبی میں بھی ایک اندرونی ترتیب مضمر ہوتی ہے جسے انشائیہ نگار اپنی تیسری آنکھ سے ڈھونڈ نکالتا ہے اور پھر اپنے طرز تحریر کے ذریعے delight in disorder والی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ جس سے تحریر کی معنویت نکھر آتی ہے۔ وہ لوگ جو disorder کی اصطلاح کو بالکل ڈھیلی ڈھالی اور غیر مربوط کے معنوں میں لیتے ہیں وہ انشائیے کے مزاج سے بخوبی آشنا نہیں ہیں۔

محمد ارشاد صاحب اپنے مضمون 'مونتین انشائیہ اور انشائیہ نگار' فنون، لاہور، جولائی اگست ۱۹۸۲ء میں لکھتے ہیں:

"انشائیہ وہ صنف نثر ہے جس میں کسی بھی علمی اور سماجی اہمیت کے حامل موضوع پر استقرائی طور پر حاصل کردہ معلومات اور ان پر مبنی آراء کو شخصی نقطۂ نظر کے طور پر گھریلو پیرایۂ بیان میں اس طرح پیش کیا جائے کہ موجودہ ترتیب میں نظم وضبط اور معلومات میں اضافے کی صورت میں آراء پر نظر ثانی کی گنجائش موجود ہو۔"

یہ رائے اس لیے محل نظر ہے کہ اس کے مطابق علمی اور سماجی اہمیت کے حامل موضوعات اور معلومات کو شخصی پیرائے میں بیان کرنے کو انشائیہ نگاری متصور کیا گیا ہے، حالانکہ انشائیہ کے لیے ضروری ہے کہ موضوعات اور ان سے متعلق معلومات کی قلب ماہیت ہو، یہ چیز ظاہر ہے کہ انشائیہ نگار کی تخلیقی اپج کے بغیر ممکن نہیں۔ محمد ارشاد صاحب کی رائے کو اگر تسلیم کرلیا جائے تو پھر انشائیہ ایک میکانکی انداز میں لکھی گئی ایسی تحریر قرار پائے گا جس میں معلومات کو واحد متکلم کے انداز میں بیان کردیا گیا ہو یا موضوع کو اس کی علمی بلندی سے نیچے اتار کر محض گھریلو زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہو، ایسی تحریر انشائیہ کی پیروڈی تو کہلاسکتی ہے مگر اسے انشائیہ کہنا ممکن نہیں ہے۔ ڈاکٹر آدم شیخ کے خیال میں:

"خودساختہ رسوم وقوانین میں جکڑا ہوا انسان شعوری یا غیر شعوری طور پر آزادی کی ایک سانس کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ انشائیوں میں ایک انسان یا فنکار کے اسی جذبۂ حیرت کی تسکین ہوتی ہے۔ انشائیہ نگار ہمیشہ ایک حقیقت کی طرف لوٹنا چاہتا ہے۔ وہ بت پرست نہیں بلکہ بت شکن ہے۔"

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

"وہ (یعنی انشائیہ نگار) تو اپنے پڑھنے والے کو دوستانہ انداز میں زندگی کے انوکھے اور دلچسپ پہلوؤں سے روشناس کراتا ہے جو عام نظروں سے پوشیدہ رہے ہوں۔" (انشائیہ، بمبئی، ۱۹۶۵ء)

ڈاکٹر آدم شیخ نے انشائیوں کو جذبہ حریت کی تسکین کا وسیلہ قرار دے کر ان حضرات کو لاجواب کردیا ہے جو کہتے ہیں کہ انشائیہ ایک غیر مقصدی صنف ادب ہے اور کسی چیز کے حصول کا وسیلہ نہیں بنتی۔ دوسرے یہ کہ ڈاکٹر آدم شیخ نے انشائیہ نگار کو بت پرست نہیں بت شکن قرار دیا ہے اور یہ بات واقعی درست ہے کہ انشائیہ نگار رسوم وقیود میں جکڑے ہوئے انسان کی اس انفعالی حالت کے خلاف ایک کھلا احتجاج ہے جو اسے بت پرستی پر مجبور کردیتی ہے۔ آرنلڈ ٹائن بی کا کہنا ہے کہ تہذیب جب روبہ زوال ہوتی ہے تو وہ کئی طرح کے بت گھڑلیتی ہے جن میں پرانی رسوم وروایات کا بت بھی شامل ہوتا ہے، لہٰذا انشائیہ نگار کا بت توڑنا اس زوال آمادہ ذہنیت کے خلاف واضح اعلان جنگ ہے جو کسی نئے تجربے یا خیال کو اپنے اردگرد پھٹکنے نہیں دیتی اور پیش پاافتادہ ڈگر پر آنکھیں بند کر کے چلنا چاہتی ہے، یہ چیز انشائیہ کی فعالیت کی تصدیق بھی کرتی ہے، ڈاکٹر آدم شیخ کی دوسری بات بھی سوفی صد درست ہے کہ انشائیہ زندگی کے انوکھے اور دلچسپ پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتا ہے اور یوں ان مخفی پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے جو عام قاری کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ پہلو انشائیہ کی سب سے بڑی پہچان ہے اور ڈاکٹر آدم شیخ نے ایک اچھے نباض کا ثبوت مہیا کیا ہے۔

انشائیہ میں ایجاز واختصار کو ملحوظ خاطر رکھنا بہت ضروری ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس سے انقباض کی صورت پیدا نہ ہو بلکہ اس کے اختصار کا دامن وسیع نظر آئے چنانچہ بعض ناقدین نے اسی بات کے پیش نظر انشائیہ کو غزل سے مماثل قرار دیا ہے مثلاً ڈاکٹر وزیر آغا کے دیباچے کے مطابق:

"انشائیہ اردو غزل کے ایک شعر میں گہری مماثلت کا احساس بھی

ہوتا ہے۔غزل کے شعر کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کسی ایک نکتہ کو اجاگر تو کیا جاتا ہے لیکن اس کے تمام پہلوؤں کو ناظر کے فکرو ادراک کے لیے نامکمل صورت میں چھوڑ دیا جاتا ہے، یہی حال انشائیہ کا ہے اس میں موضوع کے صرف چند ایک انوکھے پہلوؤں کو پیش کر دیا جاتا ہے اور اس کے بہت سے دوسرے پہلو تشنہ اور نامکمل حالت میں رہ جاتے ہیں۔"

غلام جیلانی اصغر صاحب کے مطابق:

"مزاج کے لحاظ سے غزل اور انشائیہ میں کوئی فرق نہیں لیکن ہیئت کے لحاظ سے یہ دونوں اصناف جداگانہ خاصیتوں کی حامل ہیں۔" (ادبی دنیا، بحث، انشائیہ کیا ہے؟، خاص نمبر ۹)

جب کہ جمیل آذر صاحب کے خیال میں:

"انشائیہ میں غزل کا سا ایجاز، افسانے کا تاثر، ناول کا سا فلسفۂ حیات اور ڈرامے کے انتظاریہ لمحات اور اس کے پس منظر میں طنز و مزاح کی دھیمی دھیمی سمفنی ہوتی ہے اور ان سب پر مستزاد انکشاف ذات جو انشائیے کے لیے مختص ہے۔" (اوراق، ۱۹۶۶ء، انشائیہ ایک لطیف صنف نثر)

مندرجہ بالا آراء میں ایک چیز قدر مشترک ہے اور وہ ہے انشائیہ میں شاعرانہ عناصر کی موجودگی۔ مگر میرے خیال میں انشائیہ غزل کے شعر سے نہیں بلکہ غزل مسلسل سے مشابہ ہے جس کا ہر شعر دوسرے شعر یعنی خیال کو کروٹ دیتا ہے، جس سے معنی کا پیکر قدم بہ قدم ایک داخلی آہنگ کے زور پر پھیلتا چلا جاتا ہے اور قاری elevation کی سطح تک پہنچ جاتا ہے۔ غزل کی طرح انشائیہ میں کئی پہلو تشنہ بھی رہ جاتے ہیں مگر اس تشنگی کو قاری اپنی سوچ بچار سے پورا کر لیتا ہے۔ ایک اور پہلو بھی غور طلب ہے کہ انشائیے میں دیگر اصناف نثر کی خوبو پائی جاتی ہے۔ مگر اس سے یہ قطعاً مراد نہیں ہے کہ انشائیہ محض دیگر اصناف کا مرکب ہے اور اس کی الگ پہچان نہیں ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر انور سدید صاحب کی یہ رائے بہت وزنی ہے:

"افسانوی یا ڈرامائی عناصر انشائیے کی ترتیب میں قیمتی اجزاء کا کام تو دے سکتے ہیں لیکن اس کا مجموعی مزاج نہیں بن سکتے۔" (اوراق، افسانہ و انشائیہ نمبر، ۱۹۷۲ء)

ڈاکٹر سلیم اختر صاحب لکھتے ہیں:

"انشائیہ دراصل مہذب ذہن کی ترجمانی کا نام ہے۔ اسے مہذب معاشرے میں لکھا جا سکتا ہے اور اس سے مہذب قاری لطف اندوز ہوتا ہے، لیکن انشائیہ ہر ذہن کے لیے نہیں ہے، یہ تو بالغ ذہن کے حامل مرد کے لیے ہے۔"

وہ مزید لکھتے ہیں:

"بلکہ میں تو اس حد تک جانے کو تیار ہوں کہ صرف انشائیہ ہی خالص نثری صنف ہے ورنہ کہانی اور ڈراما تک سبھی کچھ منظوم ہو سکتا ہے۔ اچھی نثر کے بغیر انشائیہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔" (اوراق، افسانہ و انشائیہ نمبر، ۱۹۷۲ء، مضمون: انشائیہ کیوں)

ڈاکٹر سلیم اختر صاحب نے اپنے اس بیان میں انشائیہ کو مہذب ذہن کی ترجمانی قرار دے کر اس بات کی ضرورت پر زور دیا ہے کہ انشائیہ نگار کے لیے polished ہونا ازبس ضروری ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ انھوں نے انشائیہ کو خالص نثری صنف قرار دے کر اس کی توقیر اور اہمیت کا واشگاف اقرار کیا ہے اور یہ بیان انشائیہ کی اثر پذیری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ البتہ ان کا یہ کہنا کہ انشائیہ صرف بالغ ذہن کے مرد کے لیے ہے محل

نظر ہے۔خود مرد کے ہاں anima اور animus کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ نفسیات اور پھر ادب میں اس قسم کی صنفی برتری یا تخصیص کا کوئی جواز نہیں ہے۔اس سلسلے میں توجہ طلب رائے مرزا حامد بیگ کی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

"مجھے اعلیٰ انشائیہ میں جذباتی سطح پر مادرسری اصول کی کارفرمائی اور پدرسری اصول کا ٹھہراؤ اور بردباری کا ایک توازن نظر آیا ہے۔"

(اوراق، انشائیہ کی کونپل، جنوری فروری ۱۹۷۸ء)

میرے خیال میں وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ انشائیہ فعالیت اور انفعالیت کا سنگم ہے، گویا یہ سونے جاگنے کی ایک ایسی درمیانی کیفیت ہے کہ جب آنکھ پوری طرح کھلتی ہے تو آدمی حیرت زا مسرت سے دوچار ہوتا ہے کہ وہ کہاں سے چلا تھا اور کہاں پہنچ گیا یا پھر دوسرے لفظوں میں یہ جان لیجئے کہ مادرسری اور پدرسری اصول کا مطلب افقی اور عمودی دونوں زاویوں کا انشائیہ میں شامل ہونا ہے۔

اب آئیے ایک اور مسئلے کی طرف!

مسئلہ یہ ہے کہ جب ہم ایسّے کے ساتھ light کا سابقہ لگاتے ہیں تو اس سے ہماری مراد کیا ہوتی ہے کیا light کا مطلب محض ہلکا پھلکا ہونا ہے یا کچھ اور؟ اس سلسلے میں یہ بات غور طلب ہے کہ انشائیے کو مضمون essay یا جواب مضمون سے متمیز کرنے کے لیے جب light essay کی اصطلاح برتی جاتی ہے تو اس سے عموماً یہ بات اخذ کرلی جاتی ہے کہ light کے معنی ہلکا پن، ہلکا پھلکا happy بمعنی خوش ہونے اور خوش کرنے کے ہیں۔اس لیے انفرادی سوچ بچار، انکشاف ذات، نکتہ آفرینی اور پاسبان عقل کی موجودگی انشائیہ میں جائز نہیں ہے۔جیسے نظیر صدیقی صاحب کا یہ ارشاد کہ:

"انشائیہ کسی نہ کسی اعتبار سے غیر سنجیدہ یعنی لائٹ ہوتا ہے۔"

(انشائیہ کیا؟ بحث ادبی دنیا، شمارہ نہم)

چنانچہ اس بات کو ذہن میں رکھ کر اچھے بھلے قلم کار اپنی تحریروں میں لطیفے، چٹکلے اور ہنسی ٹھٹھے اور چہل ایسے اجزا کو یکجا کر کے کہتے ہیں کہ ہم نے انشائیہ لکھ لیا ہے، حالانکہ لائٹ کے معنی knowledge aspect اور ingnite to thing something وغیرہ کے بھی ہیں اور یہ انشائیہ کی مروجہ صورت میں زیادہ قرین قیاس ہیں، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ تینوں عناصر باہم یکجا ہو کر انشائیے میں enlightenment کا جوہر پیدا کرتے ہیں جو فی الحقیقت انشائیے کی جان ہے۔ یہاں اس بات کو جاننا ازبس ضروری ہے کہ 'نالج' سے مراد منطقی استدلال، ٹھوس فلسفیانہ مباحث، تحقیقی مواد جمع کرنا یا ترتیب سے پیش کرنا نہیں ہے بلکہ موضوع کے بارے میں عمیق مشاہدہ مراد ہے۔ aspect کا مطلب کسی چیز، تجربہ میں پنہاں ان مختلف پہلوؤں کی تخلیقی پیرائے میں نقاب کشائی ہے جو بظاہر مخفی معلوم ہوتے ہیں، نیز انشائیے میں شگفتہ یا پرمسرت ہونے کا مطلب intellectual pleasure اور جمالیاتی حظ کا حصول ہے نہ کہ ہنسی مذاق سے پیدا ہونے والی وقتی قسم کی تفریح کی تحصیل!

اور اب ہم انشائیہ کی اس definition کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کے بارے میں خاصی بحث و تمحیص ہو چکی ہے۔ یہ تعریف ڈاکٹر جانسن کی پیش کردہ ہے۔وہ لکھتے ہیں:

"A loose sally of the mind, an irregular indigested piece, not a regular and orderly composition." (The English Essays and Essayists)

میرے نزدیک جانسن نے جس طرح اس تعریف میں انشائیہ کو ایک بے قاعدہ اور غیر منظم کمپوزیشن قرار دیتے ہوئے ناہضم مواد کا بے ترتیب ٹکڑا اور دانش کی ڈھیلی ڈھالی اختراع کہا ہے۔ ساری گڑبڑ اس تعریف کو محدود معنوں میں لینے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ڈاکٹر جانسن کی اس تعریف میں indigested کا مطلب غیر ہضم شدہ

مواد ہرگز نہیں۔ دراصل جانسن primordial images کی بات کرنا چاہتا ہے جو اصلاً ایک طرح کا کچا یا خام مواد ہوتے ہیں۔ اسی طرح regular نہ ہونے سے اس کی مراد یہ ہے کہ انشائیہ پیش پاافتادہ اسالیب اور کلیشیز کی قید و بند سے آزاد ہو، گویا وہ loose talk کی سفارش ہرگز نہیں کر رہا۔ دوسری جانب ہمارے ہاں یہ صورت ہے کہ ہم مغرب والوں کی ہر بات کو من وعدن قبول کر لیتے ہیں، چنانچہ یہی رویہ ہم نے جانسن کی تعریف کے سلسلے میں بھی برتا اور کہا کہ انشائیہ بالکل آزاد ہے اور ہم اس صنف کے لیے کسی قسم کی پابندی کے قائل نہیں ہیں یعنی 'آزاد صنف نثر' کی اصطلاح نے اردو کے متعدد ناقدین اور بیشتر قارئین کو غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا ہے اور انھوں نے اس کا مفہوم مکمل آزادی یا باالفاظ دیگر مادر پدر آزادی کے معنوں میں قبول کر لیا ہے۔ درآنحالیکہ آزاد صنف نثر کے معنی یہ بھی تو ہو سکتے ہیں کہ وہ کسی مخصوص قسم کے اصلاحی رنگ، نظریات ،تصورات وتعصّبات یا سسٹمز systems کا پرچار کرنے کی مجبوریوں سے 'آزاد' ہو، نیز اسے اختیار حاصل ہو کہ وہ جملہ علوم وفنون سے حسب منشا اکتساب کرے اور پھر انھیں ایک نئے زاویے اور ذاتی حوالے سے موضوع کی بنت میں کچھ اس طور شامل کر دے کہ ایک ایسا نیا پرت اجاگر ہو جائے جو مسرت اور فکری حظ کے حصول کا ذریعہ بھی بن سکے۔ آزاد صنف نثر کا مطلب آزادی فکر بھی ہو سکتا ہے نہ کہ اس کا مفہوم منتشر خیالی یا غیر منضبط ہونا سمجھ لیا جائے۔ اسی طرح پابندی سے مراد اگر پلاٹ 'تھیم' کردار یا وحدت زمانی ومکانی یا ٹھوس منطقی رویے کی پابندی ہے تو پھر ظاہر ہے کہ انشائیہ اس قسم کی پابندی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ویسے جانسن کی مہیا کردہ انشائیہ کی تعریف نے مغرب میں بھی خاصا ردعمل پیدا کیا ہے۔ چنانچہ C. H. Lockitt رقم طراز ہے:

> "We have travelled a long way ..... from Johnson's "loose salley of the mind; his undigested meal has become a light digestible and his disorderly composition a carefully constructed and elaborately designed work of art."
> (The Art of the Essayist)

انشائیہ کی دوسری توجہ طلب 'تعریف' ڈاکٹر وزیر آغا کی ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

> ''انشائیہ اس تحریر کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیاء یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طور گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آ کر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہوتا ہے۔''
> (پیش لفظ، دوسرا کنارہ)

پیش کردہ تعریف کی وضاحت کرتے ہوئے وہ مزید لکھتے ہیں:

> ''اس تعریف میں یہ بات مضمر ہے کہ انشائیہ ایک تو اسلوب یا انشاء کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرے یعنی زبان کو تخلیقی سطح پر استعمال کرے۔ دوسرے شے یا مظہر کے اندر چھپے ہوئے ایک نئے معنٰی کو سطح پر لائے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی بت تراش پتھر کی سل پر سے فاضل بوجھ اتار کر اس کے اندر سے وہ شبیہ برآمد کرے جو ظاہری آنکھ سے تو پوشیدہ تھی لیکن جسے بت تراش کی باطنی آنکھ نے گرفت میں لے لیا تھا۔ تیسرے انشائیہ ذہن کو بیدار اور متحرک کرے یعنی شعور کی توسیع کا اہتمام کرے۔ جب تک یہ تینوں یکجا نہ ہوں انشائیہ وجود میں نہیں آ سکتا۔'' (پیش لفظ، دوسرا کنارہ)

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ یہ 'تعریف' اردو انشائیہ کے مزاج کو سمجھنے میں کافی حد تک مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔

اس سارے جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انشائیہ کے اجزائے ترکیبی کے تعین کی حدتک تقریباً نقادایک دوسرے سے بڑی حدتک اتفاق کرتے ہیں تو پھر نزاع کس بات پر ہے! اس سلسلے میں ایک مثال سے بات واضح کرنا چاہوں گا۔ مثلاً اگر آپ کسی سے کہیں کہ ہر انسان کے دو ہاتھ، پاؤں اور دو آنکھیں دو کان ایک منہ اور ناک ہوتا ہے تو وہ فوراً کہے گا کہ مجھے اس سے اتفاق ہے مگر جب ان تمام اشیاء کا مجموعہ یعنی گوشت پوست کا جیتا جاگتا آدمی اس شخص کے سامنے آجائے تو وہ کہے گا صاحب میں تو اسے نہیں پہچانتا، بالکل یہی مسئلہ انشائیہ کے ساتھ درپیش ہے کہ اس کے salient features پر تو تقریباً سبھی نقادوں کا اتفاق ہے یعنی اسے شخصی ہونا چاہیے، اس کا اسلوب شگفتہ ہوتا ہے۔ یہ غور وفکر پر ابھارتا ہے اس میں عدم تکمیل کا احساس ہوتا ہے وغیرہ۔ مگر جب ان تمام اجزائے ترکیبی کا مرکب 'انشائیہ' سامنے آتا ہے تو بعض نقاد اور اکثر قارئین کرام اسے پہچاننے میں دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ گویا سارا مسئلہ اس کی پہچان کا ہے نہ کہ اس کی تعریف اور دائرہ کار کا!

مختلف نقادوں کی آراء کا تجزیہ کرنے کے بعد اب میں مجموعی حوالے سے انشائیہ نگاری کے فن کا محاکمہ پیش کرنا چاہوں گا تا کہ ایک متحرک تصویر نظروں کے سامنے آجائے اور ہم انشائیے کے ہمہ جہت مزاج کا احاطہ کرنے میں کامیاب ہوسکیں۔

انشائیہ ذہن کی آزاد ترنگ ان معنوں میں ہرگز نہیں ہے کہ اسے 'شعور کی رو' سے ملتی جلتی تکنیک جیسی کوئی تحریر سمجھ کر جب چاہیں ماضی کے واقعات، حال کے تجربات یا مستقبل کے سہانے سپنوں کو آپس میں گڈ مڈ کر کے کاغذ پر منتقل کرنا شروع کر دیں اور پھر دعویٰ کریں کہ انشائیہ جس قسم کے آزاد تلازمۂ خیال کا تقاضا کرتا ہے وہ ہم نے پورا کر دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انشائیہ ایک گتھی ہوئی تحریر ہے جس میں ایک نقطۂ خیال دوسرے نقطۂ خیال سے پھوٹتا ہے اور پھیل کر دوبارہ پہلے نقطہ میں سمٹ آتا ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ جب یہ دوبارہ مرکزی نقطے کو چھوتا ہے تو معنی کا ایک نیا پرت، فکر کا ایک انوکھا زاویہ اور خیال کی ایک تازہ لہر نمودار ہوجاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ انشائیہ کا مرکزی خیال 'باؤلر' کے ہاتھ میں پکڑی گیند ہے وہ جب چاہتا ہے اسے ایک زوردار ٹھپے کی صورت میں ابھری ہوئی وکٹوں کی طرف اچھالتا ہے، مگر یہ گیند تھوڑی دیر بعد مختلف ہاتھوں میں سے ہوتی ہوئی دوبارہ باؤلر کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔ یہی حال انشائیے کے مرکزی نقطے کا ہے کہ وہ مختلف پہلوؤں کو چھونے کے بعد دوبارہ انشائیہ نگار کے ہاتھ میں آجاتا ہے بلکہ انشائیہ لکھتے ہوئے اگر کسی واقعہ یا منظر کا ذکر آجائے تو وہ بھی مرکزی نقطے کے ساتھ پیوست ہوتا ہے، نہ کہ مرکزی نقطے سے پہلوتہی کرنے کے لیے برتا جاتا ہے۔ ایسا نہیں کہ ایک بات کو بیان کرنے کے بعد یہ لکھا جائے کہ 'یہ تو جملہ معترضہ تھا' اس روش نے موجودہ دور کے متعدد قلم کاروں کو غلط ڈگر پر ڈال رکھا ہے اور وہ انشائیہ کے مرکزی خیال سے منقطع ہو کر غیر متعلق باتیں کرنے لگتے ہیں یا لطائف کی آمیزش کے مرتکب ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مضحک صورت واقعہ کو نمایاں کرنے میں ہی انشائیہ کی کامیابی ہے جب کہ انشائیہ کا بنیادی جوہر نکتہ آفرینی ہے۔ جب تک اس پہلو سے روگردانی کی جاتی رہے گی اس وقت تک انشائیہ لکھا نہیں جاسکے گا اور یہ ساری کارگزاری محض چیز، تجربہ یا خیال کی بالائی سطح تک کی الٹ پلٹ یا موضوع کی ناہمواریوں پر استہزائی نظر ڈالنے اور پھر خندۂ دنداں نما کا مظاہرہ کرنے تک محدود رہے گی۔ سنگ تراش کی طرح انشائیہ نگار بھی موضوع کے ٹھوس پتھر میں سے مخروطی صفات کو تراش خراش سے اجاگر کرتا ہے نہ کہ پتھر کی کھردری سل پر چاک سے الٹی سیدھی لکیریں، کارٹون یا خاکہ نما چیزیں بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وہ پہلو ہے جسے ملحوظ خاطر رکھ کر انشائیہ اور طنزیہ، مزاحیہ مضامین کے فرق کو مزید سمجھا جاسکتا ہے۔ کچھ قلم کار کسی چیز، خیال یا تجربہ کے سطحی پہلو گنواتے چلے جانے کو بات میں سے بات نکالنے کے عمل کے مماثل جانتے ہیں مثلاً نمک کے موضوع پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے کچھ اس قسم کے طرز عمل اختیار کریں گے۔ ایک نمک حرام ہوتا ہے اور پھر نمک حراموں کے کرتوت بیان فرمادیں

گے۔ پھر ارشاد فرمائیں گے کہ ایک نمک کی کان ہوتی ہے اور رعایت لفظی کا استعمال کرڈالیں گے پھر یوں رقم طراز ہوں گے کہ ایک نمک دانی ایک نمک پارہ ہوتا ہے اور اس حوالے سے کوئی لطیفہ، چٹکلہ پیش کردیں گے اور یوں لفظی بازی گری کا مظاہرہ کرتے ہوئے تحریر کو پایۂ تکمیل تک پہنچادیں گے اور کہیں گے کہ دیکھئے جناب ہم نے نمک کے حوالے سے کتنے نکات اور صورتیں آشکار کی ہیں۔ حالانکہ آشکار کچھ نہیں کیا، محض چیزیں گنوائی ہیں اور وہ بھی نہایت سطحی طریقے سے۔ دوسری طرف اگر انشائیہ نگار نمک کو اپنا موضوع بنائے گا تو وہ انسان کی ذات میں مضمر نمکین پانی کے سمندر کا ذکر چھیڑے گا۔ نمک اور انسانی جسم کے ربط باہم پر ایک نظر ڈالے گا اور شاید نمکینی کو انسان کی فطرت ثانیہ قرار دینے کی بھی جسارت کرے گا۔ نمک سے انسان کے رشتے کو پل صراط ایسا نازک رشتہ قرار دے گا کہ ذرا سی کمی بیشی بھی اس کے توازن کو متزلزل کرسکتی ہے اور شاید آخر آخر میں وہ پانی اور نمک کے رشتے کو کسی صوفیانہ مسلک کی توضیح کے لیے بھی استعمال کرڈالے۔ غرضیکہ انشائیہ نگار کے سامنے معانی کا ایک جہان ہوشربا ہے جو نمک کے موضوع کو محض ذرا سا چھو لینے پر متحرک ہوسکتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں کوئی کلیہ قاعدہ مرتب کررہا ہوں کہ اتنے گرام شاعرانہ و متصوفانہ عناصر یا فلسفیانہ موشگافیاں یا معاشرتی وسیاسی اجزاء جب تک ایک دوسرے میں اچھی طرح حل نہ کیے جائیں انشائیہ کا محلول تیار نہیں ہوسکتا۔ دراصل یہ وہ تمام وسیلے ہیں جن کو بروئے کار لاکر انشائیہ نگار اپنے موضوع میں گہرائی اور وسعت پیدا کرنے پر قادر ہوتا ہے، مگر ان تمام عوامل کا غیر معتدل استعمال انشائیہ سے انشائیہ پن چھین لے گا اور اسے ایک ثقیل قسم کے جواب مضمون یا طنزیہ یا مزاحیہ مضمون میں مبدل کردے گا۔ یہاں میں سعد اللّٰہ کلیم صاحب کی اس بات کا ذکر ضرور کروں گا کہ:

> ''خیال ایک پتنگ کی صورت کتنی ہی بلندیوں میں پرواز کرے مگر اس کی ڈور ہر حال میں انشائیہ نگار کے ہاتھ میں رہتی ہے۔''

(انشائیہ مقبولیت کی راہ پر، اوراق، انشائیہ وافسانہ نمبر، ۱۹۷۲ء)

ان کی اس بات میں یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ جب طنز نگار دوسروں کو پتنگ اڑاتے ہوئے دیکھتا ہے تو جملے کستا ہے اور طعن وتشنیع کا حربہ استعمال میں لاتا ہے۔ اس کے برعکس انشائیہ نگار اپنے اردگرد کے ماحول کو اپنی ذات میں پنہاں ایک جہان معنی کے حوالے سے جانچنے اور پرکھنے کی سعی کرتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے وہ مجموعی خوبیوں اور خامیوں پر ہمدردانہ طریقے سے غور وخوض بھی کرتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ:

> ''انشائیہ کا ایک داخلی عنصر انشائیہ نگار کا وہ ہمدردانہ رویہ ہوتا ہے جو مثبت سوچ کا ثمر ہے۔'' (انشائیہ نگاری، مشتاق قمر، اوراق، سالنامہ، اپریل مئی ۱۹۷۵ء)

میرے خیال میں صرف یہی نہیں بلکہ انشائیہ نگار زندگی کے منفی اور مثبت داخلی و خارجی پہلوؤں کا ژرف نگاہی سے مطالعہ کرتا ہے۔ باالفاظ دیگر انشائیہ بنے بنائے قاعدوں اصولوں اور سانچوں کو جب توڑتا ہے تو پہلے داخلی طور پر تصادم (conflict) سے دوچار ہوتا ہے جس سے منفی چیزیں مثبت اور مثبت چیزیں منفی دکھائی دینے لگتی ہیں اور یوں chaos کی صورت نمایاں ہوجاتی ہے، مگر پھر انشائیہ نگار ایک تخلیقی جست بھرتا ہے اور یوں وژن، میڈیم اور آہنگ کو بروئے کار لاکر بے ہیتی کو ہیئت میں بدل دیتا ہے، جس سے تحریر میں وحدت تاثر پیدا ہوجاتی ہے۔ جمیل آذر صاحب نے اپنے مضمون 'ایک لطیف صنف نثر' میں منفی اور مثبت پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے سلسلے میں جان ے کی یہ مثال دی ہے:

> ''خوش بختی ایک نٹ کھٹ دوشیزہ ہے، جس کے لیے کسی ایک جگہ رکنا ناممکن ہی نہیں، وہ کرسی کی پشت پر سے تمہارے بالوں کو انگلیوں سے چھیڑتی ہے۔ تمہارے ہونٹوں پر ایک اڑتا ہوا بوسہ ثبت کرتی ہے اور پھر شرما کر کھلکھلاتی ہوئی بھاگ جاتی

ہے لیکن بدبختی بڑے وقار کے ساتھ تمہاری جانب آتی ہے،
تمہارے بستر پر اطمینان سے بیٹھ جاتی ہے اور پھر اون کی سلائیوں
سے تمہارے لیے ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سویٹر بننے لگتی ہے۔"
(جمیل آذر بحوالہ ایک لطیف صنف نثر، اوراق، ۱۹۶۶ء)

اس مثال سے جمیل آذر صاحب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ انشائیہ نگار کے لیے خوش بختی اور بدبختی یعنی مثبت اور منفی دونوں پہلو جاذب نظر ہیں اور ان کو نئے زاویے سے پرکھنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ میرے خیال میں یہاں اس بات کا ذکر کرنے میں بھی حرج نہیں ہے کہ انشائیہ نگار نہ تو اپنی انا ego کو اتنی وسعت دیتا ہے کہ پوری زندگی کو خود میں جذب کر لے اور نہ ہی اپنی ذات کی اس حد تک نفی کرتا ہے کہ ہر شے اسے اپنے اندر مدغم کر لے بلکہ وہ دونوں صورتوں کو ملا جلا کر ایک امتزاجی صورت پیدا کرتا ہے۔ انشائیہ نگار کے مقابلے میں مزاح نگار اپنی ذات کو ہدف بنا کر اس کا تمسخر اڑاتا ہے اور یوں دوسروں کے لیے سامان تفنن مہیا کرتا ہے۔ ایسا کرنا کوئی عیب نہیں بلکہ یہ تو مزاح نگار کی تکنیک ہے۔

انشائیہ نگار کی حتی المقدور کوشش اس بات میں ہوتی ہے کہ جس چیز، خیال یا تجربے کو وہ بیان کر رہا ہو وہ خود بخود اپنی نقاب کشائی کرتا چلا جائے۔ اس سے قطع نظر 'غیر معمولی سنجیدگی' کو صرف اس وقت ہی اپنے پیکر میں جگہ دے سکتا ہے جب یہ آسوب آگہی سے پیدا ہوئی ہو۔ یا یوں سمجھ لیجیے کہ جب غیر معمولی سنجیدگی اپنی آخری رکاوٹ کو عبور کرتی ہے تو ایسی معنی خیز غیر سنجیدگی وجود میں آتی ہے جس کا دوسرا نام خود شناسی ہے اور انشائیہ اسی کیفیت کو خود میں سمونے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ ایک اچھے انشائیے کی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ سہ ابعادی three dimensional ہوتا ہے یعنی وہ چیز خیال اور تجربے کے مقررہ مفہوم میں مستور نئے معانی کو منکشف کرتا ہے، جس سے وہ چیز، خیال اور تجربے کے مقررہ مفہوم کی دیوار پر فریم میں لگی تصویر کی طرح محض دو ابعادی نہیں رہتا بلکہ فاصلہ، گہرائی اور اونچ نیچ کا احساس اسے ایک سچ مچ کے منظر میں تبدیل کر دیتا ہے اور ناظر اس سارے منظر نامے میں چلتا پھرتا اور اس کی نزاکتوں اور لطافتوں سے براہ راست لطف اندوز ہونے لگتا ہے۔

کفایت لفظی انشائیہ کے اسلوب نگارش میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہر اچھے انشائیہ کا ایک ایک لفظ چنیدہ ہونا چاہیے۔ اس کی عبادت میں مترادفات کا کم سے کم استعمال ہونا ضروری ہے تا کہ لفظوں کے ضیاع سے بچا جا سکے۔ انشائیہ کی انشا کا 'خیال' کی ندرت سے بھی بڑھ کر اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ خیال کی باریکیوں اور لطافتوں کو تخلیقی اور منجھی ہوئی انشاء ہی سنوار کر پیش کر سکتی ہے۔ چنانچہ ایک معیاری انشائیہ وہی شمار ہوگا جس میں اسلوب رواں دواں، مترنم اور کفایت لفظی کا حامل ہوگا۔ یہاں اس چیز کی صراحت بھی ضروری ہے کہ بعض قلمکار انشائیہ میں غیر معمولی سنجیدگی کو غلط طریقے سے در آنے دیتے ہیں اور اس پر مستزاد instrumentalism کے انداز کو اختیار کرنے سے، جس کے مطابق instruments for social action ہوتے ہیں، ان کی تحریروں میں تکرار بازی اور افادیت پسندی کے علاوہ خطیبانہ استدلالی انداز اور ناصحانہ انداز فکر کو دخل اندازی کی کھلی اجازت بھی مل جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ انشائیے جیسی کومل صنف نثر اس قسم کے طرز نگارش کی قطعاً متحمل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اس نوع کا پیرایۂ اظہار اپنانے والوں کو انشائیہ نگار کہنا بہت مشکل ہے، انھیں زیادہ سے زیادہ مضمون نگار یعنی essayist ہی کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ انشائیے کے infra structure میں انشاء اور اسلوب کو اساسی اہمیت حاصل ہے اور اس کے super structure میں احساس، مشاہدہ اور تجربہ کلیدی رول ادا کرتے ہیں تو غلط نہ ہوگا، اس کے ساتھ ہی ساتھ انشائیے میں تجربے کی دونوں صورتوں کا امتزاج بھی مل جاتا ہے یعنی ایک وہ تجربہ جو اشیاء کے مشاہدے سے عبارت ہے اور دوسرا وہ جو اشیاء کے مفہوم کو گرفت میں لیتا ہے۔ جہاں تک تشبیہاتی، تلمیحاتی،

استعاراتی اور تمثیلی انداز بیان کا تعلق ہے تو یہ چیز یقیناً زبان کی تروتازگی اور نفاست میں گونا گوں اضافہ کرتی ہے لیکن ان محاسن کا غیر معتدل استعمال خیال کی دھار کو کند کر کے اسلوب کی گل کاری اور مرصع سازی euphistic style کا موجب بن سکتا ہے اور قاری کا ذہن تشبیہ اور استعارے کی ندرت اور طراوت کی داد دینے کی طرف زیادہ مائل ہوجاتا ہے۔ یہ چیز شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ مگر انشائیے کے سلسلے میں یہ محض اضافی خصوصیت ہے جس کا برمحل استعمال ہونا چاہیے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ نوجوان انشائیہ نگاروں میں یہ پہلو نسبتاً نمایاں ہے، وجہ یہ ہے کہ نوجوانوں کے ہاں جذباتیت کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے، چنانچہ وہ نت نئی تشبیہات کے ذریعے اپنی بات کو نئی نویلی شکلیں دیتے ہیں جس سے شاعرانہ عناصر اور اضافتوں کا استعمال ان کی تحریروں میں کچھ ضرورت سے زیادہ ہوجاتا ہے، مگر درحقیقت یہ عمر کی مجبوری ہے جیسے جیسے ان کی عمر، علم اور تجربے کا دائرہ وسیع ہوگا یہ اجزاء بھی بتدریج مدھم پڑنے لگیں گے تا آنکہ تحریر کی وہ صورت ابھر آئے گی جو ہر لحاظ سے پختہ اسلوب نگارش کا نتیجہ ہوتی ہے۔ انشائیے کے اسلوب کے ضمن میں رشید امجد کی اس رائے میں بڑا وزن ہے، لکھتے ہیں:

> ”انشائیہ میں اسلوب کی دو باتیں خصوصی ہیں، اول یہ کہ اشیاء کو لفظوں اور لفظوں سے اشکال میں ڈھالنے کی وہ قدرت جس سے ان کی داخلی اور خارجی تصویریں بنتی چلی جاتی ہیں۔ دوسرے وہ اعلیٰ درجہ کی روبھی جو سلاست و بلاغت کے ساتھ ایک ادبی معراج اور حسن بھی رکھتی ہے۔“ (ڈاکٹر رشید امجد، اردو زبان انشائیہ نمبر، ۱۹۸۳ء، انشائیوں کی ایک نئی کتاب)

مزاحیہ طرزِ اظہار کا استعمال انشائیے میں ایک بڑی حد تک انشائیہ نگار کے خاص موڈ پر مبنی ہوتا ہے۔ بلکہ انشائیہ نگار تو ناہمواریوں کے بجائے ناہمواریوں کے بطون میں کار فرما ابدی سچائیوں کو بیان کرتا ہے۔ یہاں 'مزاحیہ لب و لہجے' اور 'مزاح نگاری' کے مابین فرق کو ملحوظ خاطر رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس نوع کے انشائیے جن میں مزاحیہ لب ولہجہ اختیار کیا جاتا ہے بعض دفعہ ایک عام قاری کو مزاحیہ تحریریں نظر آتے ہیں، لیکن اگر وہ ان کا بغور مطالعہ کرے تو وہ دیکھے گا کہ مزاحیہ لب و لہجے کے حامل جملوں میں کوئی دوسری نسبتاً گہری بات بیان کی گئی ہے، ایک نیا انکشاف ہوا ہے، یہی وہ نقطۂ تقاطع (nodel point) ہے، جہاں سے طنزیہ مزاحیہ مضمون اور مزاحیہ لب ولہجہ رکھنے والے انشائیے کی حدود اور سمتیں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہوجاتی ہیں، مگر اس مقام پر اکثر قارئین ان کے باہمی فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور یوں بات الجھ کر رہ جاتی ہے۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

> ”انشائیہ کی بحث میں عموماً شگفتگی کو طنز و مزاح کا مترادف تصور کرلیا جاتا ہے اور اس طرح انشائیہ اور ظرافت کی حدود کو آپس میں گڈمڈ ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔“

اس فرق کے ادراک کے لیے یہ چند مثالیں دیکھئے۔ مزاحیہ انداز کی ایک مثال:

> ”صاحب، سائیکل کیا ہے یہ تو چوں چوں کا مربہ ہے۔ اس پر بیٹھتے ہی انسان سرکس کا کوئی مسخرہ نظر آنے لگتا ہے بعض اوقات تو یوں لگتا ہے کہ عامل پر معمول سوار ہو کر جا رہا ہو۔“

طنزیہ انداز کی مثال:

> ”معاشی نظام کے سائیکل کی گدی بیٹھ گئی ہے اور اخلاقی روایات کا ایکسل ٹوٹ چکا ہے جب کہ باقی ماندہ روایات مڈگارڈوں کی طرح کھڑکھڑ کر رہی ہیں اور معاشرے کے بریک کبھی کے فیل ہو چکے ہیں۔“

انشائیہ کا انداز:

> ”زندگی ایک ایسا سال خوردہ سائیکل ہے جس پر سوار ہو کر میں راستے

کے نشیب و فراز اور راہ میں آنے والے ہر گڑھے کو بصورت ایک
حادثہ اپنے جسم و جاں پر براہ راست محسوس کرتا ہوں اور یوں گویا
زندگی کے مختلف دھچکوں سے مسلسل روشناس ہوتا چلا جاتا ہوں۔''

انشائیہ میں 'انکشاف ذات' سے مراد محض لکھنے والے کی ذات کا اظہار نہیں ہے، بلکہ اس میں اس چیز، خیال یا تجربے کی مکمل اکائی بھی شامل ہے جس پر وہ طبع آزمائی کرتا ہے اور یوں ان تمام صورتوں کو ان کے مقررہ اور مخصوص معانی سے الگ کر کے ان میں نئی معنویت اور نئے امکانات کو ذاتی وابستگی کے حوالے سے اجاگر کرتا ہے۔ ایسا کرنے سے وہ صورت سامنے آتی ہے جسے ہم شخصی حوالہ personal touch کا نام دیتے ہیں۔ مگر یہ شخصی حوالہ کسی ذاتی ڈائری کی صورت میں نہیں ہوتا کہ اسے ہم لکھنے والے کے شخصی معاملات، نجی مسائل یا خود کلامیوں تک محدود کر دیں۔ اس کے علاوہ انشائیہ کے موضوعات کے انتخاب میں بھی انشائیہ نگار کی ذاتی دلچسپی کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ مثلاً آئس کریم کھانا، اخبار پڑھنا، بچہ پالنا یا حقہ پینا وغیرہ یہ تمام موضوعات بالواسطہ اور بلاواسطہ انشائیہ نگار کی وابستگی کو نمایاں کرتے ہیں اور قاری کو ان کا مطالعہ کرنے کی تحریک دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں ایک اچھا انشائیہ فرد کی وجدانی ضرورتوں کو پورا کرنے کا وسیلہ بھی بن سکتا ہے۔ بقول مرزا حامد بیگ:

''انشائیہ تو meditation سے جنم لیتا ہے۔'' (انشائیہ کی کونپل،
اوراق، جنوری فروری ۱۹۷۸ء)

یعنی یہ بات برملا کہی جا سکتی ہے کہ انشائیے کا رخ بصارت سے بصیرت کی طرف ہے۔ وہاں بصیرت سے بصارت کی طرف بھی ہے۔ گویا انشائیہ نگار double vision کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اسی طرح انشائیہ نگار کسی ایکسپریشینسٹ expressionist کی طرح نہ تو دن میں خواب دیکھتا ہے اور نہ ہی علامت پسندوں کی طرح خارج کو فقط inner absolute کا عکس سمجھنے لگتا ہے بلکہ وہ تو جوہر اور وجود کو بیک وقت اہمیت دیتا ہے اور انھیں ایک ہی سکے کے دو رخ سمجھتا ہے، چنانچہ انشائیہ نگار کے نزدیک خیال idea اور ہیئت form ایک نامیاتی وحدت رکھتے ہیں اور یوں خارج و باطن کا سنگم انشائیہ میں موضوعی اور معروضی انداز فکر کو بیک وقت شامل کر دیتا ہے جس سے اس کی اثر پذیری میں اضافہ ہو جاتا ہے اور یہ سب کچھ موضوع سے انشائیہ نگار کی ذاتی وابستگی کے بغیر ممکن نہیں۔ ڈاکٹر آدم شیخ کے خیال کے مطابق:

''انشائیہ نگار فرد کو جماعت یا جزو کو کل پر ترجیح دیتا ہے۔''

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انشائیہ نگار کسی ivory tower کا باسی ہے اور ارد گرد کی زندگی اور اس کی اجتماعیت سے اسے کوئی علاقہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فرد کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک اس کا شخصی پہلو اور دوسرا اجتماعی پہلو۔ اجتماعی پہلو اس کی ذات میں مضمر ہوتا ہے۔ چنانچہ انشائیہ نگار جب فرد کی ترجمانی کرتا ہے تو اس کے اجتماعی پہلو کے حوالے سے زندگی اور معاشرے کے کل کو بھی پیش کر دیتا ہے مگر لطف یہ ہے کہ وہ محض زمانۂ حال کے معاشرے سے کہیں زیادہ اس معاشرے کو درخور اعتنا سمجھتا ہے جو اس کی ذات میں مستور ہوتا ہے اور اس معاشرے کو بھی اہمیت دیتا ہے جو اس کے خوابوں کی آماجگاہ ہے اور جس کے مستقبل میں طلوع ہونے کے واضح امکانات موجود ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انشائیہ کسی محدود مقصدیت کا نہیں بلکہ ایک وسیع ترانکشافی اور غیر فانی رویے کا علمبردار ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر اچھے انشائیے کی یہ خوبی ہے کہ اس کا آخری جملہ یا پیراگراف موضوع کے سارے بکھرے ہوئے دھاگوں کو جوڑ کر ایک ایسی مکمل صورت تشکیل دے ڈالتا ہے جس کو دیکھتے ہوئے loose sally of the mind والی بات محض انشائیہ کا ایک پہلو ہی دکھائی دیتی ہے۔ گویا فنی تکمیل انشائیہ کی سب سے بڑی خوبی ہے بصورت دیگر انشائیہ stray thoughts کی سطح سے اوپر ہی نہ اٹھ سکے۔ اس سلسلے میں چند انشائیوں کے اختتامی جملے ملاحظہ کیجئے اور دیکھئے کہ ان کی مدد سے انشائیہ نگار نے کس طرح انشائیہ کی فنی تکمیل کی ہے:

مثال نمبر۱ ”ویسے احباب واقربا کی سہولت کے لیے بھی قبر پر نیم پلیٹ کا ہونا ضروری ہے لیکن نیم پلیٹ وہی ہوگی جو مجھے پسند ہے۔ مجھے یہ بات ہرگز گوارا نہیں کہ مرنے کے بعد عزیز واقارب اپنی پسند کی نیم پلیٹ میری قبر پر لگائیں۔(انشائیہ : نیم پلیٹ، جمیل آذر)

مثال نمبر۲ ”جب میرا مکان بالکل تیار ہوجائے گا تو میں اس کے سائے میں بیٹھ کر اپنے رشتۂ ازدواج پر غور کروں گا اور سوچوں گا کہ کیا دھرتی یعنی مکان سے وابستہ رہنا بہتر ہے یا مکان کی ’مکانیت‘ سے نکل کر غیر محدود فضا میں چہل قدمی کرنا؟“(انشائیہ : مکان بنانا، غلام جیلانی اصغر)

مثال نمبر۳ ”لیکن اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ شخصیت کی تکمیل آندھی کے بے رحم تھپیڑوں ہی کی رہین منت ہے اور جس شخص کی زندگی میں کبھی آندھی نہیں آئی، اس کی حالت قابل رحم اور اس کی ذہنی پختگی محل نظر ہے۔“(انشائیہ: آندھی، ڈاکٹر وزیر آغا)

مشکور حسین یاد نے انشائیہ کو’ام الاصناف‘ کہا ہے۔اس سے اگر ان کی یہ مراد ہے کہ اصناف ادب میں سب سے پہلے انشائیہ نے جنم لیا تھا تو یہ بات قرین قیاس نہیں ہے۔ان معنوں میں صرف شاعری ہی کو ام الاصناف کہنا واجب ہے۔البتہ انشائیہ کو ایک حد تک امتزاجی صنف کہہ لیجئے کہ اس میں افسانہ کی علامتی گہرائی، ڈراما کا تجسس، ناول کی ہمہ گیری، فلسفہ کی زیرکی اور مشاہدہ پسندی، شاعری کی معنی آفرینی اور جدت خیالی اور نفسیات کی دروں بینی یہ سب لکھنے والے کے ذاتی تجربے اور شعور کا حصہ بن کر ایک نئے افق کو سامنے لانے کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔انشائیہ نگار کے دائرہ کار کے ضمن میں آرتھر کرسٹوفر بنس رقم طراز ہے:

"He does not see life as the historian, or as the philosopher, or as the poet, or as the novelist, and yet he has touch of all these." (The Art of the Essayist).

(مرتبہ سی اینچ لاکٹ)

یوں بھی انشائیہ نگار اس سارے جہان کا ادراک the world is my idea کے حوالے سے کرتا ہے۔اس لیے یہ تمام گوشے بصورت واردات اس میں ازخود شامل ہوجاتے ہیں اور اسے حسی ادراک سے آگے کی چیز بنا دیتے ہیں۔آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ وہ لوگ جو صنف انشائیہ کی مقبولیت اور اثر پذیری کو انشائیہ پڑھنے اور لکھنے والوں کے گراف کی کمی بیشی سے جانچنے کی سعی فرماتے ہیں۔میرے خیال میں درست نہیں کرتے۔کیونکہ انشائیہ جس قسم کا مزاج رکھتا ہے اس کو سمجھنے اور اس سے لطف کشید کرنے کے لیے تربیت اور ریاضت کی اشد ضرورت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ باطنی دنیا سے نشر ہونے والے پیغامات کو receive کرنے کے لیے انشائیہ لکھنے اور پڑھنے والے کے ذہنی چینل کا ذکی الحس ہونا بھی ضروری ہے، تبھی وہ ایک اچھا receiving set بن سکتا ہے۔لہٰذا گنتی کر کے کہنا کہ چونکہ انشائیہ نگاروں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔ اس لیے یہ ہر دلعزیز صنف نثر کا درجہ نہیں رکھتی، فی الحقیقت زود اندیشی کا مظاہرہ کرنا ہے۔ مختصر یہ کہ اردو ادب میں انفرادی سوچ جس خون کی کمی کا شکار تھی انشائیے نے اس کو حتی المقدور پورا کرنے کی کوشش کی ہے اور میں اسے انشائیے کی ایک دین متصور کرتا ہوں۔ باقی رہا انشائیے کی ترویج کا معاملہ تو اس ضمن میں انشائیہ کی خودکار نمو پذیری نے اس کے خدوخال کو واضح کیا ہے اور اسے برتر مقام کی طرف لے جارہی ہے۔ میں رشید امجد صاحب کے ان کلمات کے ساتھ ہی اس مضمون کا اختتام کرتا ہوں:

”جدید انسان کبھی اپنے حوالے سے کائنات کو اور کبھی کائنات کے حوالہ سے اپنے آپ کو سمجھنے کی جستجو کر رہا ہے، یہ دوہرا سفر پیچیدہ بھی ہے اور قدم قدم پر نئے نئے انکشافات اور اسرار سے بھی بھرا ہے۔

اس پیچیدگی کشف اور اسرار کا بہترین اظہار انشائیہ ہی کے ذریعہ ممکن ہے اس لیے میرے خیال میں انشائیہ ہی مستقبل کا سب سے اہم پیرایۂ اظہار ہوسکتا ہے۔ انشائیہ اب ایک رجحان نہیں، تحریک بن چکا ہے۔ ایک ایسی تحریک جو بتدریج مستقبل کے اظہار کا ذریعہ بنتی چلی جارہی ہے۔" (انشائیوں کی ایک نئی کتاب، انشائیہ نمبر ۱۹۸۳ء، اردو زبان)

(ماخوذ: اشارے، ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، روالپنڈی، ۲۰۱۱ء)

OOOO

جمیل آذر

انشائیہ: انفرادی سوچ کا محرک

ادب کی ہر صنف زمانے کے تابع ہے اور زمانہ ساکت و جامد نہیں۔ یہ ہر دم رواں پیہم رواں ہے۔ نیرنگئ وقت کے ساتھ کوئی صنف ادب دم توڑ دیتی ہے اور کوئی عالم وجود میں آ کر اپنا سکہ بٹھا لیتی ہے۔ جب دور شہنشاہیت تھا تو شعرا کرام دربار تک رسائی حاصل کرنے کے لیے پرشکوہ قصیدے لکھا کرتے تھے اور اپنے فن کا مظاہرہ کر کے نہ صرف دادِ سخن پاتے بلکہ اپنا منہ موتیوں سے بھی بھر لیتے۔ لیکن وقت نے کروٹ لی اور شہنشاہیت نے اپنی بساط لپیٹی اور اس کے ساتھ ہی فن قصیدہ گوئی دنیائے ادب سے رخصت ہوا۔ اب اگر کوئی شاعر کسی حاکم وقت کی مدح سرائی میں قصیدہ لکھتا ہے تو اسے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ قصیدے کی طرح داستان گوئی کا رواج بھی اب نہیں۔ ایک وقت تھا زندگی ٹھہری ہوئی تھی لوگوں کے پاس وقت کی فراوانی تھی۔ رات گئے تک لوگ داستانوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اب نہ وہ وقت ہے اور نہ داستان گوئی ہے۔ یہ سب اجتماعی ٹھہرے ہوئے معاشرے کی اصناف ادب تھیں جواب تاریخ کا حصۂ پارینہ بن کر رہ گئی ہیں۔

عالمی جنگ اول اور جنگ دوم کے بعد سائنس اور ٹیکنالوجی میں حیرت انگیز انقلاب آیا اور اس کے ساتھ ہی کاروانِ حیات کلی طور پر جدید دور میں داخل ہو گیا۔ زندگی کی رفتار بیل گاڑی اور گھوڑا گاڑی سے نکل کر ریل گاڑی اور ہوائی جہاز کے ساتھ قدم ملانے لگی۔ اس تیز رفتاری کے ساتھ وقت کی قلت اور عدیم الفرصتی کا احساس ہونے لگا، داستان کی جگہ ناول نگاری نے لی اور پھر اس کے ساتھ ہی افسانہ نگاری نے جنم لیا۔ افسانہ نگاری کے ارتقاء میں جہاں اور بہت سے عوامل ہیں وہاں وقت کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تھوڑے سے وقت میں بہت کچھ بیان کرنے کے رجحان نے افسانہ نگاری کو خاصا عروج بخشا۔ یہی خوبی غزل کی ہے جو تا حال وقت کے ساتھ چل رہی ہے۔ اس صنف سخن کی مخالفت کے باوجود اس کی پذیرائی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ یہ اپنے مخصوص اختصار، ایجاز، مزاج اور تاثر کے اعتبار سے اس برق رفتار دور کا ساتھ بطریق احسن دے

رہی ہے۔ مجھے یہاں ہر صنف ادب کے بارے میں بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ کہنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ وقت اور صنف ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کوئی صنف اظہار نہ تو بے وقت جنم لیتی ہے اور نہ زندہ رہتی ہے۔ اس زاویہ نگاہ سے اگر دیکھا جائے تو انشائیہ اپنے زمانے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر معرض وجود میں آیا ہے۔ دور شہنشاہیت یا غیر جمہوری دور میں انشائیہ کے وجود میں آنے اور فروغ پانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا قطع نظر کسی انفرادی مثال کے انشائیہ تو صرف جمہوری ماحول ہی میں فروغ پا سکتا ہے، چونکہ جمہوری ماحول میں انفرادی سوچ، انفرادی رویہ اور انفرادی مشاہدہ ومطالعہ پنپتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انشائیہ (light essay) نے جتنا فرانس، انگلینڈ اور امریکہ میں فروغ پایا اتنا کسی اور ملک میں پھل پھول نہ سکا۔ انشائیے نے پاکستان کے عالم وجود میں آنے کے بعد اس سرزمین میں اپنا وجود تسلیم کروایا۔ وجہ یہ کہ پاکستان بنیادی طور پر جمہوریت کی پیداوار ہے اور یہاں کے افراد ذہنی طور پر جمہوری اقدار کے حامل ہیں۔

ہم کسی صنف ادب کو اس کی قوم کے مزاج سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ چونکہ آزادئ فکر ہمارے مزاج میں ہے اس لیے انشائیہ کا پاکستان میں نشو ونما پانا بالکل فطری امر تھا۔ لہٰذا گزشتہ بیس سالوں میں اس صنف ادب نے حیرت انگیز ترقی کا مظاہرہ کیا۔ انشائیہ اپنے مزاج، اسلوب اور ہیئت کے اعتبار سے انفرادی سوچ کا محرک ہی نہیں بلکہ مظہر بھی ہے۔ ہمارے ہاں سوچ کا اجتماعی اسلوب ہمیشہ سے فعال رہا ہے چنانچہ محاورے اور ضرب المثال جو ایک طرح wisdom capsules تھیں ہمارے ہاں زیادہ مقبول رہی ہیں۔ اس طرح ہم نے باہر سے بنے بنائے نظریات اور امثال فکر (thought patterns) قبول کر لیے ہیں اور ہماری سوچ کھائیوں میں چل رہی ہے، اس سے تقلیدی روش عام ہوئی ہے اور تخلیقی اپج کے راستے مسدود ہو گئے ہیں۔ انشائیہ کی اہمیت اور وصف خاص اس بات میں ہے کہ اس نے بنے بنائے فکری سانچہ سے ہٹ کر شخصی سطح پر سوچ کی انفرادیت کا مظاہرہ کیا یوں ایک طرف تو اس نے تسلیم شدہ حکیمانہ گولی (wisdom capsule) کو تشکیک کی نظروں سے دیکھا ہے تو دوسری طرف بظاہر معمولی اور سامنے کی اشیاء اور باتوں کو نئی معنویت سے لبریز کیا ہے۔ انشائیہ ہمارے فکری رویہ کو اس قدر متاثر کر رہا ہے کہ بالآخر یہ ہماری دوسری اصناف میں خون کی کمی کے عارضے کو ختم کرنے کا موجب ثابت ہوگا۔

انشائیہ نگار بنیادی طور پر منفرد رویہ، منفرد مزاج اور منفرد سوچ کا حامل ہوتا ہے۔ وہ کبھی تو اشیاء اور مظاہر کو صوفی کی نظر سے دیکھتا ہے اور کبھی فلاسفر کے سبھاؤ میں ان پر گہری نظر ڈالتا ہے۔ کبھی وہ جمالیاتی فکر میں ڈوب کر زندگی کے مختلف گوشوں میں حسن و رعنائی تلاش کرتا ہے، کبھی اپنے مثبت رویہ اور عارفانہ بصیرت سے زندگی کی تلخیوں، پریشانیوں اور دشوار راہوں کو آسان اور خوسگوار بنا دیتا ہے۔ انشائیہ اپنے مزاج میں سب کچھ ہو سکتا ہے مگر قنوطی ہر گز نہیں۔ قنوطی ذہن کا حامل فرد نہ تو انشائیہ کو سمجھ سکتا ہے اور نہ انشائیہ تخلیق کر سکتا ہے۔ انشائیہ کے لیے غیر متعصب ذہن ہی درکار نہیں بلکہ آزاد منش (liberal minded) ہونا بھی ضروری ہے۔ انشائیہ زندگی کے بندھے ٹکے نمونوں، اصولوں اور مقرر راستوں سے ہٹ کر نئے پیکروں اور تمثیلوں کو تخلیق کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انشائیہ نگار اپنا انشائیہ تخلیق کرتا ہے تو وہ زندگی کو از سر نو تخلیق کرتا ہے۔ تخلیق کا یہ عمل دلکش بھی ہے اور حیرت انگیز بھی۔ انشائیہ میں خاص نکتہ یہ ہے کہ یہ اجتماعی بنی بنائی سوچ کے پیٹرن کے برعکس شخصی سطح کی سوچ کو بروئے کار لا کر مظاہر حیات کے نئے گوشے، نئے پہلو اور نئے معنی پیش کرتا ہے۔ مثلاً اگر کلیہ یہ ہے کہ عالم کی فراست (wisdom of the learned) انسان کا قیمتی سرمایہ ہے تو انشائیہ نگار اپنی فکری بصیرت سے عالم کی جہالت (ignorance of the learned) کو موضوع بنا کر تصویر کا دوسرا رخ پیش کر دیتا ہے۔ یاد رہے کہ وہ ہر بار مخالف رخ ہی پیش نہیں کرتا۔ بعض اوقات مروج سوچ کے پیٹرن کو نئے زاویے سے پیش کر کے اس کی دلکش توسیع کا بھی اس طور سے اہتمام کرتا ہے کہ اس میں تازگی اور نکھار ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہ زیادہ

نمایاں اور ممتاز ہو جاتی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے آپ شاہراہ پر سفر کرتے کرتے... اچانک شاہراہ کو چھوڑ کر ایک ضمنی راستہ (by-pass) اختیار کر لیں اور قوس میں سفر کر کے دوبارہ شاہراہ پر آجائیں اس طور کہ باہر سے دیکھنے والوں کو محسوس یہ ہو کہ ضمنی راستہ کے شامل ہو جانے سے شاہراہ کشادہ ہو گئی ہے۔ انشائیہ نگار ہمیں وسعت آشنا کرتا ہے، وہ ایک مدار سے نکال کر ہمیں نئے مدار میں لاتا ہے۔ یہاں بے ساختہ وزیر آغا کا خوبصورت انشائیہ 'چرواہا' مجھے یاد آ گیا جو شعور کو نئے مدار میں پہنچانے کی عمدہ مثال ہے۔ اس انشائیہ سے دو اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''چرواہے کی چھڑی دراصل ہوا کا ایک جھونکا ہے اور ہوا کے جھونکے کو مٹھی میں بند کرنا ممکن نہیں۔ اسے تو دیکھنا نہیں۔ البتہ جب وہ آپ کے بدن کو مس کرتے ہوئے گزرتا ہے تو آپ اس کے وجود سے آگاہ ہو جاتے ہیں، وجود ہی سے نہیں آپ اس کی صفات سے بھی آگاہ ہو جاتے ہیں، کیونکہ بنیادی طور پر ہر جھونکا ایک پیغام بر ہے۔ وہ ایک جگہ کی خوشبو دوسری جگہ پہنچاتا ہے۔ یہی کام چرواہے کا بھی ہے۔ تمام لوک گیت چرواہوں کے ہونٹوں پر لرزتے ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے رہے ہیں...''

اسی انشائیہ کا ایک دوسرا اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیں:

''میں تو صرف ان چرواہوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو مویشیوں کے ریوڑ چراتے چراتے ایک روز انسانوں کے ریوڑ چرانے لگتے ہیں۔ تب ان کی چھڑی عصا میں بدل جاتی ہے۔ ہونٹوں پر اسم اعظم تھر کنے لگتا ہے۔ وہ انسانی ریوڑوں کو پہاڑ کی چوٹی پر لا کر یا صحرا کے سینے میں اتار کر یا دریا کے کناروں پر بکھیر کر اس بات کا انتظام کرتے ہیں کہ یہ ریوڑ اپنی کہنگی اور پیوست کو گندی اون کی طرح اپنے جسموں سے اتار پھینکیں...''

اس انشائیے کی کئی پرتیں اور تہیں ہیں، ہر پرت ہمیں ایک مدار سے نکال کر دوسرے مدار میں لے جاتی ہے۔ وہ عام چرواہے سے بات کا آغاز کرتے ہیں۔ پھر اچانک ایک زقند کے ساتھ وہ ہمیں ان چرواہوں تک لے جاتے ہیں جو ہماری لوک ثقافت کے امین ہیں، پھر وہ ہمیں ایک اور ذہنی اڑان عطا کرتے ہیں اور ان چرواہوں تک پہنچا دیتے ہیں جو ہماری روحانی اور تہذیبی اقدار کے امین ہیں اور جو خود تسبیح کے دانوں کی طرح پوری کائنات میں بکھر جاتے ہیں۔'

یہ انشائیہ مروجہ سوچ کے مدار سے نکل کر دوسرے مدار میں پہنچنے کی خوبصورت تصویر پیش کرتا ہے۔ اس انشائیہ میں وہ موضوع کے ساتھ سفر کرتے، پھر گریز اور واپسی کے عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایسا خوبصورت انشائیہ وہی شخص لکھ سکتا ہے جس کا مشاہدہ تیز، مطالعہ گہرا اور ذہن طباع ہو۔

انشائیہ نگار کے فن کا مظاہرہ اس وقت بھی ہوتا ہے جب وہ اجتماعی مروجہ سوچ سے ہٹ کر اپنی انفرادی سوچ سے تصویر کا دوسرا رخ پیش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر زندگی میں عام رویہ گالی دینے کے خلاف ہے، ہم اس فعل کو اپنی سماجی زندگی میں نہایت معیوب اور اخلاق سوز تصور کرتے ہیں اور ایسا تصور کرنا بھی چاہیے کیونکہ یہ ہماری تہذیبی، معاشرتی اور تمدنی زندگی کے خلاف ہے۔ لیکن جب گالی دینے کا فعل انشائیہ نگار کی انفرادی فکر کی زد میں آتا ہے تو اس کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے۔ وہ اسے نفسیاتی قرار دے کر یوں پیش کرتا ہے:

''گالی کے قومی فوائد کا میں نے ابھی ذکر نہیں کیا۔ جس طرح پردے کے کچھ قومی فائدے ہیں مثلاً آدمی بدصورت عورتیں دیکھنے سے بچ جاتا ہے اسی طرح آدمی گالی دینے سے نیوراتی کیفیات سے بچ جاتا ہے۔ اگر گالیاں عام ہو جائیں تو پاگل خانے کی بنیاد میں خلل پیدا

ہوجائے۔ مزید برآں گالی دینے سے جمہوریت کو فروغ ملتا ہے، آمریت صرف اسی دور میں پنپ سکتی ہے جب گالیوں پر قدغن لگادی جائے۔ اس لیے ایک اچھے جمہوری نظام میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ اسمبلی کی کاروائی میں نکتۂ اعتراض کا آغاز اور انجام گالی پر ہوتا ہے۔ اقتصادی توازن کو برقرار رکھنے کے لیے گالی کا وجود ناگزیر ہے۔ جب مارکیٹ میں قیمتوں میں اضافہ کا رجحان پایا جائے تو آدمی اسی تناسب سے گالیوں میں اضافہ کرتا جائے۔'' (گالی دینا، غلام جیلانی اصغر)

آپ نے غور فرمایا کہ گالی جیسی مکروہ چیز کو انشائیہ نگار نے اپنے منفرد زاویۂ فکر سے psychiatry (دماغی امراض کے علاج) کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہ منفرد سوچ اور رویہ ہی کا کرشمہ ہے کہ انشائیہ نگار نے زندگی کے مروجہ پیٹرن سے ہٹ کر ایک نیا پیٹرن ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ غلام جیلانی اصغر کا یہ انشائیہ اپنی ہیئت واسلوب کے اعتبار سے نہ صرف منفرد ہے بلکہ تازگی وتوانائی سے بھرپور ہے۔

انشائیہ نگار کبھی اشیاء مظاہر فطرت اور افراد کو عارفانہ نظر (mystic vision) سے دیکھتا ہے۔ یہ رویہ بھی اس کی سوچ کی انفرادی سطح کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس کی خوبصورت مثال ہمیں وزیر آغا کے انشائیہ 'بارہواں کھلاڑی' میں ملتی ہے۔ کرکٹ کی ٹیم میں بارہواں کھلاڑی کسی آڑے وقت کے لیے وقف ہوتا ہے۔ لیکن انشائیہ نگار جب اسے عارفانہ بصیرت سے دیکھتا ہے تو اس کھلاڑی کی قلب ماہیت کچھ اس طرح ہوجاتی ہے:

> ''بارہواں کھلاڑی ایک ایسا ہی سچا صوفی ہے۔ وہ بیک وقت اپنی ٹیم سے منسلک بھی ہے اور جدا بھی۔ وہ میدان میں پہلی کے چاند کی طرح آتا ہے جو دوسرے ہی لمحے رخصت بھی ہوجاتا ہے۔ وہ کرکٹ کے کھیل کا نباض، مفسر، کارکن اور جاسوس ہونے کے باوجود اپنے دامن کو تر نہیں ہونے دیتا۔ ہونٹوں پر ایک عارفانہ مسکراہٹ سجائے وہ قلب مطمئنہ کا مظاہرہ کرتا ہے...'' (بارہواں کھلاڑی، وزیر آغا)

آپ نے دیکھا انشائیہ نگار کی نظر کرکٹ کی ٹیم کے اس کھلاڑی پر مرکوز ہوجاتی ہے جسے عام تماشائی کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے لیکن انشائیہ نگار کی انفرادی نظر نے اسے ہی فوکس میں لیا۔ اس انشائیہ میں بارہواں کھلاڑی ایک کلچر ہیرو کے روپ میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ یہی انشائیہ نویس کا کمال ہے کہ وہ ہمیں انبوہ کثیر سے چند ایسے چبھتے ہوئے مناظر دکھاتا ہے کہ ایک طرف ہماری بصیرت وسعت آشنا ہوجاتی ہے تو دوسری طرف ہمیں حیرت ومسرت سے ہمکنار ہونے کا موقعہ مل جاتا ہے۔

انفرادی سطح کی سوچ کی ایک عمدہ مثال ہمیں ڈاکٹر انور سدید کے دلکش انشائیہ 'دسمبر' میں ملتی ہے۔ عام طور پر دسمبر کا مہینہ سردی کے آغاز کا مہینہ سمجھا جاتا ہے اور یہی اجتماعی خیال یا رائے بھی ہے۔ لیکن انشائیہ نگار اجتماعی روش سے ہٹ کر اپنی انفرادی فکر کو بروئے کار لا کر اسے مشخص (personify) کرکے مردانہ پن کی علامت قرار دیتا ہے اور اسے نہایت تزک واحتشام سے اپنے ڈرائنگ روم میں وارد ہوتے ہوئے دکھاتا ہے:

> ''دسمبر آتا ہے تو کسی مہمان کی طرح کال بیل (call ball) کو دبا کر اپنی آمد کا اعلان نہیں کرتا بلکہ ایک شریر بچے کی طرح پائیں باغ کی دیوار پھاند کر پہلے گھر کے صحن میں آتا ہے پھر برآمدے میں پلاسٹک سے بنی ہوئی کرسی پر اکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ میری بیوی اس کے مخصوص قدموں کی چاپ پہچانتی ہے۔ وہ جلدی سے آتش دان میں آگ جلا کر کرسیوں کو اس کے گرد نصف دائرے میں ڈال دیتی ہے۔ درمیان میں ایک چھوٹی سی میز رکھ دیتی ہے اس میز پر بھاپ اگلتی نوبیاہتا لیڈی لپٹن، ٹی کوزی کا گھونگھٹ اوڑھے ہمہ تن اشتیاق بنی منتظر ہوتی ہے۔ سامنے چاندی کی چھوٹی چھوٹی کٹوریوں

میں پستہ، بادام اور کشمش آجاتے ہیں۔ہم سب افراد خانہ جو گزشتہ گرمیوں میں جز داًجزاداً اکائیوں میں بٹ گئے تھے۔ اب ایک دوسرے کے اتنے قریب آجاتے ہیں جیسے کٹی ہوئی پھانکیں دوبارہ تربوز میں سما گئی ہوں۔" (دسمبر، انور سدید)

ملاحظہ کیجئے کہ دسمبر کس طرح بے تکلف دوست کی طرح انشائیہ نگار کے برآمدے میں براجمان ہوتا ہے اور پستہ، بادام، کشمش اور چائے سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ یہ انشائیہ ہمیں (keats) کیٹس کی شہرہ آفاق نظم خزاں (ode to autumn) کی یاد دلاتا ہے۔جس طرح کیٹس موسم خزاں کو کھیتوں میں، کھلیانوں میں، انگوروں کے رس نکلنے کے عمل میں اور شیریں پکے پھگوں میں مشخص صورت میں دکھاتا ہے اسی طرح انور سدید موسم سرما کو دسمبر کا نام دے کر مشخص صورت میں پستہ و بادام میں چائے کے گرم گرم گھونٹ میں، دہکتے کوئلوں کی تمازت و حرارت میں دکھاتا ہے۔ دسمبر کو انشائیہ نگار نے واضح طور پر اپنے ذہن میں تشکیل کیا اور اپنی رگ رگ میں محسوس کر کے اس کے حسن و رعنائی سے لطف اندوز ہی نہیں ہوا بلکہ نہایت زوق وشوق کے ساتھ اسے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا۔۔۔یہی انشائیہ نویس کی سوچ کا منطقی نتیجہ ہوتا ہے۔ بے جا نہ ہوگا اگر اردو انشائیہ نگاروں کے انشائیوں میں سے چند نمونے یہاں پیش کر دوں جس سے ایک طرف تو ان کی انفرادی سوچ کی غمازی ہوتی ہے اور دوسرے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کس طرح انشائیہ نگار موضوع کا نیا رخ پیش کرتا ہے اور وہ کس طرح مروجہ اجتماعی فکری پیٹرن سے ہٹ کر انفرادی فکری پیٹرن پیش کرتا ہے:

☆ "فٹ نوٹ پر حقارت کی نظر ڈالیے، نہ جانے کب کاگ اڑے، کب اس بوتل میں بند جن باہر نکل آئے۔ متن کے زیر سایہ بظاہر بے ضرر سا، پاؤں سمیٹے فٹ نوٹ چھلاوے کے تمام اوصاف حسنہ رکھتا ہے۔ اس میں بلا کی قوت نمو دو بالیدگی ہوتی ہے، بڑھتے بڑھتے وہ متن پر امر بیل کی طرح چھا جاتا ہے۔" (فٹ نوٹ، کامل القادری)

☆ "بے ترتیبی زندگی میں ترتیب کا شعور عطا کرتی ہے، میں کتنے لوگوں کو روزانہ حواس باختہ دیکھتا ہوں، ان کی کوئی چول بھی سیدھی نظر نہیں آتی، لیکن جب ان کے گھر جائیے تو حیرت میں پڑ جائیے کہ وہ کتنی باقاعدہ، سجی سجائی، دھلی دھلائی، مکلف اور ڈرائی کلین زندگی گزار رہے ہیں۔" (بے ترتیبی، احمد جمال پاشا)

☆ "پوسٹ کارڈ بہت مسکین طبیعت کا مالک ہوتا ہے، لیکن کبھی کبھی اسے شرارت سوجھ جاتی ہے۔ پھر وہ سفر کرنے کی سوچتا اور میز پر سے کھسک کر دوسرے تھیلے میں چلا جاتا ہے۔۔۔" (پوسٹ کارڈ، رام لعل نابھوی)

☆ "دھوتی غالباً واحد لباس ہے جس کا نہیں الٹا سیدھا۔ آپ آنکھیں موند کر خود اعتمادی سے اس کے حلقہ بگوش ہو جائیں آپ پر نہ ہی کسی کی انگلیاں اٹھ سکتی ہیں اور نہ ہی آپ کسی کا نشانۂ تضحیک ہو سکتے ہیں۔ جیسا کسی دوسرے لباس کو الٹا پہن کر ہونا پڑتا ہے۔" (دھوتی، ارشد میر)

☆ "اگر آپ کو کبھی کمبل اوڑھنے کا تجربہ ہوا ہے (اور مشرق میں یہ تجربہ ناگزیر ہے) تو آپ یقینا مجھ سے اتفاق کریں گے کہ پہلی نظر میں بالکل غیر ارادی طور پر کمبل میں لپٹے ہوئے شخص پر ایک ایسے قلعہ بند جنرل کا گمان ہوتا ہے جس کے سپاہی عین معرکہ میں تنخواہیں وصول کرنے چلے گئے ہوں اور جو تن تنہا فصیل کا دفاع کرنے میں مشغول ہو۔" (اقبال کی ایک تصویر، مشتاق قمر)

☆ "ہر دکاندار 'مکڑی' کی طرح اشیاء پر جال پھیلا کر اس کے عین

درمیان مجسم آنکھ بنا آنے والے کا انتظار کرتا ہے اور جب آنے والا ایک بار قریب آجاتا ہے تو پھر اس کی چکنی چپڑی باتوں کے جال سے باہر نہیں جاسکتا...''(جال، سلیم آغا قزلباش)

☆ ''دوراندیشی دراصل ہوا سے لڑنے کا نام ہے۔ اس ہوا سے جس کا رخ ابھی متعین نہیں ہوا۔''(دوراندیشی، اکبر حمیدی)

☆ ''بدصورتی آپ کو دعوت فکر دیتی ہے اور آپ کی سوچ کے لیے نئی نئی راہیں کھول دیتی ہے جب کہ خوبصورتی آپ کو اپنی خوشبو کے حصار میں قید کرلیتی ہے۔''(بدصورتی، سلمان بٹ)

☆ ''میں عنقریب عمر کے اس نقطۂ اتصال پر پہنچنے والا ہوں جہاں دونوں وقت گلے ملتے ہیں۔ گویا آئندہ چند سالوں میں میں اس عالم برزخ میں پہنچ جاؤں گا جس کے ایک جانب جوانی کی جنت اور دوسری جانب بڑھاپے کا دوزخ ہوگا، جہاں نوجوان مجھے بزرگ سمجھ کر مجھ سے شرمائیں گے اور بزرگ مجھے نوجوان جان کر مجھ سے کترائیں گے اور میں ایک کٹی پتنگ کی طرح اس عالم رنگ و بو میں ڈولتا پھروں گا۔''(برزخ، بشیر سیفی)

☆ ''میری نگاہ سے دیکھا جائے تو ارض وسما کی ہر جاندار اور بے جان شے ایش ٹرے کا روپ دھارے ہوئے ہے یا کم از کم اس سے تعلق خاص رکھنے کی بنا پر زندۂ جاوید ہو کر رہ گئی ہے۔ انسان ہی کو لیجئے ایک اچھی بھلی ایش ٹرے ہے جس کے ظرف میں عمر کا ہاتھ ماہ و سال کی راکھ سانس کی صورت میں گراتا رہتا ہے گویا انسان ایک چلتی پھرتی متحرک ایش ٹرے ہے جو راکھ کے دم قدم سے زندہ ہے...''(ایش ٹرے، جان کاشمیری)

انگریزی ادب تو انشائیوں سے مالامال ہے۔ وہاں تو انفرادی رویہ ہی انشائیوں کی روح ہے۔ لی ہنٹ (leigh hunt) اپنے معرکتہ الآرا انشائیہ دریچہ (window) میں ایسی خوبصورت فکری لہریں پیش کرتا ہے کہ قاری ارضی پستیوں سے بلند ہو کر آسمانی نعمتوں کو چھونے لگتا ہے۔ اپنے انفرادی رویہ کے تحت وہ قطرے میں کائنات کبریٰ کا مشاہدہ کرتا ہے اور دریچے کو اپنے لیے ایک تصویر کے فریم سے مشابہت دے کر اس میں چلتی پھرتی تصویروں کا نظارہ کرتا ہے۔ دریچہ اس کے لیے ایک ایسا تصویری فریم ہے جس میں وہ کبھی اڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھتا ہے، کبھی بادلوں کے بجروں کو آسمان پر تیرتے دیکھتا ہے۔ مصنف کی انفرادی سوچ نے دریچہ کو اس کے لیے جہان معنی کا استعارہ بنا دیا ہے اسی طرح اے پی ہربرٹ (a. p. herbert) اپنے ایک لطیف فکر انشائیہ 'باتھ روم کے بارے میں' (about bathroom) ایسے غسل خانہ کا تصور پیش کرتا ہے کہ جس میں وہ نہ صرف نہا سکے بلکہ ورزش بھی کر سکے۔ یہی نہیں بلکہ وہ ایسی تصویریں بھی اس میں آویزاں کرنا چاہتا ہے جن میں فوجی دستوں کو خندقوں کی طرف بھاگتا ہوا، بارش میں بھیگتے قطار میں کھڑے بس کا انتظار کرتے ہوئے لوگ اور ہوائیں چلتی ہوئی برف باری کے منظر ہوں۔ کیونکہ اس کے نزدیک ایسے ہی غسل خانے میں غسل کرنے کا لطف آتا ہے۔

انشائیہ نگار ایک ذی فہم تماشائی اور حساس دل کا مالک ہوتا ہے۔ وہ زندگی کا تماشا کھلے ذہن اور روشن آنکھ سے کرتا ہے۔ وہ روزمرہ کے معمولات میں غیر معمولی بات اور پیش پا افتادہ اشیاء میں چھپا ہوا انوکھا پہلو پا لیتا ہے۔ انشائیہ نگار عام لوگوں سے اس لیے مختلف ہوتا ہے کہ عام لوگ آنکھیں رکھتے ہوئے بھی آنکھ کے لینز (lens) کو کیمرہ مین کی طرح استعمال نہیں کرتے جبکہ انشائیہ نگار اپنی آنکھ کے لینز کو کیمرہ مین کی طرح استعمال کرتا ہے اور یوں وہ زندگی کا مشاہدہ، مطالعہ، تجزیہ، ترجمانی اور عکاسی اپنی شخصی سطح کی سوچ کے مطابق کرتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح وہ چرواہے میں پیغمبرانہ صفات کا دیدار

کرتا ہے، گالی میں دافع امراض کے عناصر (therapeutic elements) تلاش کرتا ہے۔ دسمبر کے مہینہ میں بے تکلف دوست کی جلوہ آرائی کا دیدار کرتا ہے۔ یوں وہ اپنی انوکھی سوچ اور حیرت و تجسس سے مملو روشن آنکھ سے زندگی کی بوقلمونی کا نظارہ کرتا ہے۔ انشائیہ نگار روزانہ کے ملنے والے دوستوں میں، معمول میں آئی ہوئی اشیاء میں، روزمرہ کی عادات میں، ماضی کے گزرے ہوئے حادثات و واقعات میں، حال کے خلفشار میں اور مستقبل کے سنہری خواب میں اپنی فکری بصیرت کو بروئے کار لا کر نئے دلآویز پہلو ڈھونڈ نکالتا ہے۔ اس طرح وہ ہمیں ذہنی آسودگی intellectual relief عطا کرتا ہے۔ شاعری کی مزاجاً اپروچ جذبے اور خلوص کی صداقت سے ہوتی ہے۔ اس لیے شاعری ہمیں جذباتی آسودگی emotional relief عطا کرتی ہے۔ اس لیے ہم اس شاعری سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں جو ہمارے جذبۂ احساس کی تسکین کرتی ہے۔ شاعری کے علی الرغم انشائیہ کی اپروچ زیادہ تر ذہنی ہوتی ہے، وہ ہمیں ذہنی آسودگی بخشتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ جذبات سے منقطع ہو جاتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ یہاں جذبہ زیریں سطح میں چلا جاتا ہے اور بالائی سطح پر فکر کی ضوفشانی ہوتی ہے یوں ہمیں انشائیہ جمالیاتی حظ بھی بہم پہنچاتا ہے لیکن زیادہ تر یہ ہمیں ذہنی آسودگی بخشتا ہے۔ انشائیے کی اس خصوصیت کے پیش نظر ڈاکٹر جانسن نے اس کے بارے میں کہا تھا کہ یہ a loose sally of mind یعنی ذہن کی آوارہ خرامی ہے۔ ہماری سوچ اور فکر کو جتنی آزادی اس صنف ادب میں ملتی ہے شاید ہی کسی اور صنف اظہار میں اتنی آزادی ملتی ہو۔ دیکھئے اس فکری آزادی کا اظہار نئے انشائیہ نگاروں کے ہاں کس خوبصورتی سے ہوا ہے:

☆ ''کبھی کبھار جب میں ڈرائی کلینر dry cleaner سے رجوع کرتا ہوں تو اسے کہتا ہوں میرے ان گنہگار روحوں جیسے میلے کچیلے کپڑوں کو بپتسمہ دے دے مگر انہیں آتشین پریس کے ذریعہ سماجی جاندار بنانے کی زحمت نہ اٹھا۔'' (محمد اسد اللہ، پریس کیے ہوئے کپڑے)

☆ ''تکلف کا ایک تعلق اس شخص سے ہے جو تکلف برت رہا ہے اور ایک اس شخص سے جس سے تکلف برتا جا رہا ہے۔ تکلف برتنے والا اگر کبھی تکلف سے پیش نہیں آتا اور گھر آئے ہوئے مہمان کو بلا تکلف کہہ دیتا ہے کہ جناب مہینہ کی آخری تاریخیں ہیں، ملازمت پیشہ آدمی ہوں، روکھا سوکھا ہی پیش کر سکوں گا اور پھر واقعی روکھا سوکھا ہی حاضر کر دیتا ہے تو اس کی سفید پوشی اور عزت و وقار کا جو بھی بھرم ہوگا کھل جائے گا۔'' (حامد برگی، تکلف)

☆ ''یہ کال بیل اگر کسی تماش بین کے ہاتھ میں ہو تو من چلوں کے لیے پیغام رقص بن جاتی ہے، سپہ سالار کے ہاتھ میں ہو تو نقارۂ جنگ کہلاتی ہے، اہل قافلہ کے ہاتھ میں ہو تو نالۂ جرس اور کسی مفکر کے ہاتھ میں ہو تو بانگ درا!۔'' (کال بیل، محمد یونس بٹ)

☆ ''یاد انسان کی دوست اور تنہائی کی ساتھی ہے۔ یہ وہ منصف ہے جو بیتے دنوں کی اچھی بری باتوں کو جزا سزا دیتی ہے۔ حسین اور خوبصورت یاد ہونٹوں کے گلاب کھلا دیتی ہے تو تلخ یاد آنسوؤں کے سیلاب لے آتی ہے جو اندر کی کچی یادوں کو گرا دیتا ہے۔'' (یاد، محمد یونس بٹ)

☆ ''خدا کا فرمان یاد آتا ہے ''ہم نے ساری کائنات کو سات دنوں میں تخلیق کیا ہے۔'' میں سوچ رہا ہوں کہ جب پوری کائنات سات کے ہندسے کی اسیر ہے تو آخر ان سات سروں کی ان سے کوئی نہ کوئی مشابہت تو ضرور ہے۔ لیکن یہ کیسی مشابہت ہے، اس کا مجھے علم نہیں!'' (روح کی غذا، راجہ محمد ریاض الرحمن)

☆ ”خوشامد وہ لوری ہے جو انسان کے وحشی پن کو سلا دیتی ہے اور صبح کی پہلی کرن بن کر سوئی ہوئی معصومیت کے گلابی گالوں کو چھوتی ہے اور اسے بیدار کر دیتی ہے۔“ (خوشامد، اظہر ادیب)

☆ ”دراصل سارے موسم ہمارے اندر ہیں۔ وہ جرثوموں کی طرح شریانوں کے اندر دبکے پڑے رہتے ہیں۔ جب کبھی ہمارا مدافعتی نظام کچھ کمزور پڑتا ہے تو وہ لپک کر باہر آتے ہیں اور ہم پر سوار ہو جاتے ہیں۔“ (امجد طفیل، موسم)

یہ تمام انشائیے ہمیں ذہنی آسودگی عطا کرتے ہیں۔ یہ ہمارے راہوار فکر کو مہمیز لگاتے ہیں اور مزید نکات کی طرف اشارہ کرنے والے (pointers) کا کام سر انجام دیتے ہیں۔ لی ہنٹ کا 'دریچہ'، وزیر آغا کا 'چرواہا'، غلام جیلانی اصغر کا 'گالی دینا'، انور سدید کا 'دسمبر'، مشتاق قمر کا 'اقبال کی ایک تصویر' اور سلیم آغا قزلباش کا 'جال'۔ ہماری فکر کے مزید دریچے وا کرتے ہیں اور یوں یہ ہمیں ایک ذہنی اور جمالیاتی طمانیت سے شرف یاب کرتے ہیں۔ اس اضطراب انگیز دور میں ادب کی یہ صنف اظہار نہایت موثر کردار ادا کر رہی ہے۔

گزشتہ چند برسوں میں متعدد نئے انشائیہ نگار آسمان ادب پر طلوع ہوئے ہیں جس سے ایک طرف تو انشائیہ کی مقبولیت کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ فن کار انفرادی سطح پر اپنے موڈ، اپنے خیال اور اپنے مشاہدے کا اظہار کرنے کے لیے کس درجہ بے تاب تھا۔ اسے جونہی اپنے ذاتی پیرایۂ اظہار کے لیے انشائیہ کا فارمیٹ (format) ملا اس نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ موجودہ دور میں جسے جمہوری سائنسی دور کہنا صحیح ہوگا، فرد کی آزادی اور اس کی سوچ کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ آج اجتماعی آزادی کے ساتھ انفرادی آزادی کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں انشائیہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور اس کی ترقی کے امکانات مستقبل میں روشن نظر آ رہے ہیں۔

(ماخوذ: انشائیہ انفرادی سوچ کا محرک، جمیل آذر، ماہنامہ اوراق، لاہور، انشائیہ نمبر، اپریل مئی ۱۹۸۵ء)

OOOO

راجہ محمد ریاض الرحمٰن

اردو انشائیہ: ایک پھیلتا آفاق!

انشائیہ کے متعلق کچھ کہنے سے پہلے ایک نگاہ ان حالات پر ڈالنا نہایت موزوں ہوگا جن میں انشائیہ کی صنف نے جنم لیا۔ یہ حالات جن کا میں تذکرہ کرنا چاہتا ہوں، ان کے بھیانک پن کو ولیم فاکنز کے یہ الفاظ بہتر طریقے پر عریاں کرتے ہیں: ”آج ہر آدمی کے سامنے ایک ہی سوال ہے کہ میں کہاں بھک سے اڑ جاؤں گا۔“ یہ الفاظ ایک ایسے دور کے عکاس ہیں جس کا ہر فرد لایعنیت کا شکار ہے، اسی لایعنیت نے اسے انسان سے 'شئے' کی ہیئت میں ڈھال دیا ہے اور یہ کھوکھلا نعرہ زور سے گونجنے لگا کہ man is the measure of all things نا گہانی آفات اور سماوی مصائب سے ممکنہ حد تک بچاؤ کے ذرائع سائنس نے انسان کو مہیا کر دیے پھر بھی اسے یہ احساس دیمک کی طرح چاٹے چلا جا رہا ہے کہ وہ پتھر کے دور کے انسان سے بھی کمزور اور لاچار ہے۔

سائنسی ترقی نے جہاں ممالک کے درمیان فاصلوں کو سمیٹا وہاں دلوں کے درمیان خلیج بڑھاتی چلی گئی۔ نئی نئی دریافتوں نے معاشی سطح پر انسان کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ بے چہرگی کا شکار ہو کر رہ گیا۔ انسانوں کا سیلاب دور افتادہ علاقوں سے امڈ کر اعداد و شمار

کے اسیر شہر میں پھیل گیا جہاں پہنچ کر اس کی انفرادیت برف کے مانند پگھل گئی اور اس کی ذات ایک ایسی مشین کی ہیئت اختیار کر گئی ہے جسے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے حرکت دی جاتی ہے۔ انسان مادی لحاظ سے خوشحال ہو گیا لیکن روحانی طور پر مفلس ہو گیا۔ منشیات کا استعمال عام ہو گیا، ذہنی الجھنیں بڑھ گئیں۔ سماجی ناہمواری نے بے راہ روی، ہیجان انگیزی، جنسی تلذذ، تشدد اور آوارگی جیسے کئی جرائم پیدا کیے۔ نئے نئے مسائل پیدا ہونے لگے۔

اس بحران نے منطقی ایجابیت اور وجودیت جیسے قنوطی فلسفے کو خلق کیا۔ مابعد الطبیعات کا انکار کرنے کے بعد امکانات اور احتمالات کو بڑے خوفناک انداز میں پیش کیا گیا۔ پاسکل کے بقول ''اس کائنات میں میں کیا ہوں، کچھ بھی نہیں اور یہ کہ مجھ ہی میں وہ سب ہی کچھ موجود ہے جو کہیں نہیں ہے خود کائنات میں بھی نہیں۔''

میکانکی نظریۂ حیات نے مذہب کو توہم پرستی کے مترادف قرار دے دیا، نطشے نے تو کھلم کھلا اعلان کر دیا کہ 'خدا مر چکا ہے۔'' مذہب کے ابطال نے دائمی اقدار کے ڈھانچے کو شدید نقصان پہنچایا، الفاظ اپنے معنی کھو بیٹھے۔ روڈلف کارنپ نے تصور، مطلق، غیر مشروط، لامتناہی ہستی موجود، عدم، شے بالذات، وجود برائے ذات اور صدور جیسی تمام اصطلاحات کو مفہوم سے عاری قرار دے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اشتہار اور پروپیگنڈہ کے بل پر ایک کھوکھلی تہذیب منصۂ شہود پر آئی۔ دوستی، صداقت، خلوص و وفا، شفقت، دیانت اور شرافت کی جگہ ریاکاری، تصنع، مکروفریب اور دیگر اخلاق سوز حرکات نے لے لی۔

انسان کی انا یا خود ادعائی (self assertion) پر پہلا وار کوپرنیکس نے کیا جس نے کائنات کے مرکز کو ذرے میں تبدیل کر دیا یہ ایک کائناتی وار (cosmologiacal blow) تھا۔ دوسرا وار انیسویں صدی میں ڈارون نے کیا جس نے انسان کا شجرۂ نسب حیوان سے جا ملایا۔ یہ ایک حیاتیاتی وار تھا (biological blow)۔ تیسرا وار فرائڈ نے کیا جس نے انسانی انا کو محکوم قرار دیا۔ یہ ایک نفسیاتی وار (psychological blow) تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ ڈارون نے انسان کو حیوان کا جسم دیا اور فرائڈ نے حیوان کی شہوت اور جبلت۔ اور انسان اس انکشاف کی روشنی میں پرانی اقدار کو چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔

یہ ان حالات کا مختصر سا ناکہ ہے جن کا کتھارس ادبی سطح پر کرنے میں انشائیہ نے بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ انشائیے نے کمرشیل معیشت کا پردہ چاک کیا۔ جبریت کا خول توڑ کر فرد کو سکہ بند خیالات سے آزاد کرایا۔ مجہولیت اور اندھی اجتماعیت کی لغویت کے خلاف جذبۂ جہاد پیدا کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فرد کے ارادے، عمل اور ذہنی توازن اور سچی اقدار کی اشاعت کی اور دو چار سخت مقامات کو حوصلے سے طے کرتے ہوئے بالآخر اس منزل تک آپہنچا جس کی ایک کامیاب جھلک اس وقت اوراق انشائیہ نمبر کی صورت میں سامنے آئی ہے۔

اوراق کے انشائیہ نمبر میں سلیم آغا قزلباش کا ایک مقالہ چھپا ہے جس کا عنوان ہے 'انشائیہ ایک ہمہ جہت صنف نثر!' اس مقالہ میں انھوں نے یہ نتائج اخذ کیے کہ انشائیہ میں محض خارج کی تصویر کشی نہ ہو، مزاح کا عنصر ہمیں سطحی قہقہے کی تحریک نہ دلائے، علامت کا استعمال اگر ہو تو وضاحت طلب نہ ہو، ملکی اور بین الاقوامی سطح پر بے حسی کی مذمت، جبریت کے تدارک کی خواہش، اخلاقی اقدار سے بیگانگی کا ماتم، جیسے مسائل اگر انشائیہ میں در آئیں تو ان کا انداز ناصحانہ یا مبلغانہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے نیز انشائیہ نگار پر کسی بھی مرحلے سے گزرتے ہوئے جھنجھلاہٹ طاری نہیں ہونی چاہیے کیونکہ جھنجھلاہٹ قنوطیت کی علامت ہے اور بقول پروفیسر جمیل آذر ''قنوطی شخصی انشائیہ نہیں لکھ سکتا۔''

سلیم آغا نے اپنے مقالے میں انشائیے کی تمام تعریفوں کا تجزیہ کیا اور میں نے دیکھا کہ انھوں نے جن تعریفوں کو قابل استحسان جانا ان تمام کا عکس انشائیوں میں جھلملاتا نظر آتا ہے۔ میں ان کی علیحدہ علیحدہ مثالیں ذیل میں پیش کرنا پسند کروں گا۔

۱۔ ڈاکٹر جانسن a loose sally of mind (ذہن کی آوارہ مزاجی)

”میں جب بھی کھیتوں میں لہلہاتے ہوئے گیہوں کے خوشے دیکھتا ہوں، میرے ذہن میں یہ خیال سرسراتا ہے کہ دھرتی ایک شکاری کی طرح اپنے کاندھے پر چھڑی (fishing rod) لٹکائے انسان نما مچھلیوں کے شکار پر نکلی ہے، دھیرے دھیرے لوگ اس کے پیٹ کے تھیلے میں جمع ہوتے جارہے ہیں۔ یہی دانۂ گندم کل ابلیس کے ہاتھوں میں کانٹا بن گیا تھا۔ آج زمین ہمیں اس میں پھنسا کر دھیرے دھیرے اپنے حلق تک کھینچ رہی ہے۔ نظر اٹھا کر دیکھیں اور غور کریں تو اس دھرتی پر لذاندارضی کے سینکڑوں کانٹے ہماری گھات میں نصب، ہمارے اندر چھپے ہوئے بھوک اور اشتہا کے نئے نئے چہرے تلاش کررہے ہیں۔“ (انڈہ، محمد اسداللہ)

۲۔ ہاوسٹن پیٹرسن:

”یہ مفکرانہ ہوگا لیکن سنجیدہ نہیں۔ وہ ہمیں مصنف کی رائے سے اتفاق کی ترغیب دے سکتا ہے لیکن وہ ہمیں اتفاق پر مجبور نہیں کرے گا۔“

اب اس تعریف پر پورا اترنے والی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

”البتہ کسی مذہب یا فرقے کو تولیے کے کفن پر قدغن نہیں لگانی چاہیے بلکہ اسے اپنانے سے قبروں میں مردوں کو گرمیوں میں ایئرکنڈیشن جیسا سرور اور سردیوں میں ہیٹر جیسی حرارت نصیب ہوگی۔“ (تولیہ، ارشد میر)

”شہر جتنا بڑا ہوتا ہے اتنا ہی گونگا ہوتا ہے۔“ (آہٹ، شہزاد احمد)

۳۔ سی ڈی پنٹو :انشائیہ کا لب ولہجہ سبک بھی ہوسکتا ہے اور سنجیدہ بھی۔ اس میں کوئی کہانی کسی واقعہ کی منظرکشی یا کسی نظریہ کی تشریح ہوسکتی ہے۔

چند مثالیں:

”اگر تعلیم کا مقصد کچھ اقدار کو برقرار رکھنا ہے تو پھر ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تعلیم کے سارے زیریں اور بالائی درجوں کو بلڈ گروپ کی طرح الگ الگ خانوں میں بانٹا جاتا اور بچوں کی تعلیمی صلاحیت سے زیادہ ان کی خونی درجہ بندی کو مدنظر رکھا جاتا تا کہ کبوتر با کبوتر، باز با باز والی پالیسی پر عمل ہوسکتا لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ماہرین تعلیم، تعلیم کے علاوہ انسانی شرافت کے بنیادی کلیوں سے بھی نا آشنا ہیں۔“ (وراثت، غلام جیلانی اصغر)

”یہاں اس مسئلے کو ذرا پھیلا کر سمجھنے کے لیے مشکل یہ ہے کہ ڈارون کی تھیوری آورد ہوتی ہے کہ دنیا میں وہی رہے گا جو اپنے اندر زندگی کی صلاحیت رکھتا ہے یا زندہ رہنے کے گر سے واقف ہے۔“ (پھرتے ہیں شیرخوار، طارق جامی)

”بڑھاپے میں انسان کو پہلی مرتبہ صحیح معنوں میں اپنی توانائی کا احساس ہوتا ہے چونکہ جہدالبقار میں اس نے زندہ رہنے کا ثبوت فراہم کردیا ہے جب کہ ہزارہا لوگ نوجوانی میں ہی زندگی کی صعوبتوں کے آگے ہتھیار ڈال کر پسپا ہوجاتے ہیں۔“ (بڑھاپا، حامد برگی)

”دوسری طرف (دسترخوان کے برعکس) کسی بھی بوفے ضیافت کا تصور کیجئے تو آپ کو نفسا نفسی، خودغرضی اور چھینا جھپٹی کا احساس ہوگا اور ڈارون کا نظریہ آپ کو بالکل سچا اور برحق نظر آنے لگے گا۔“ (دسترخوان، وزیر آغا)

”میں جب بھی انگڑائی کی ماہیت پر غور کرتا ہوں تو ڈارون کی تھیوری

پر میرا شک یقین میں بدل جاتا ہے۔ اس نے محض بندر کو انسان کا جدامجد قرار دیتے وقت نہ جانے اس کی کس خوبی کو مدنظر رکھا حالانکہ انگڑائی جیسی ہمہ گیر صفت کا مطالعہ کیا جائے تو انسان کا رشتہ بندر سے تو کیا ننھی منی چڑیا سے لے کر شیر تک سے ملایا جاسکتا ہے۔"
(انگڑائی، محمد اقبال انجم)

مذکورہ بالا مثالوں میں جہاں آپ کو نظریے کی تشریح یا انداز دگر دکھائی دے گی وہاں (سوائے پہلی مثال کے) آپ کو اس عجیب اتفاق کا احساس ہوگا جو چار مختلف انشائیہ نگاروں نے ایک ہی نظریہ (ڈارون کی تھیوری) کے مختلف انداز میں اپنانے سے ہوا۔ آج ڈارون کے نظریۂ ارتقا نے معاشرے پر جو سنگین اثرات مرتسم کیے ہیں، ان کا ششں پہلو انکشاف انشائیہ نگار کی عصری آگہی کا بین ثبوت ہے۔ اب آئیے انشائیہ کی ان دو تعریفوں کی طرف جنھیں میں نے ایک ساتھ لیا ہے۔

۴۔ آرتھر کرسٹوفر:

"He does not see life as the Historian or as the Philospher, or as the Poet, or as Novelist, and yet he has a touch of all these."

۵۔ جمیل آذر:

"انشائیہ میں غزل کا سا ایجاز، افسانے کا تاثر، ناول کا فلسفہ اور ڈرامے کے انتظاریے لمحات اور اس کے پس منظر میں طنز و مزاح کی دھیمی دھیمی سمفنی اور ان سب پر مستزاد انکشاف ذات جو خاص انشائیہ کے لیے مختص ہے۔"

چونکہ ان تعریفوں میں انشائیے کے کئی پہلوؤں کی نشاندہی کی گئی ہے لہٰذا مناسب ہوگا کہ ہر پہلو کے لیے الگ الگ مثال مہیا کی جائے شاید اس کے بعد یہ بتلانے کے لیے زور بیان یا استدلال کی احتیاج باقی نہیں رہے گی کہ انشائیہ نگار متفرق موضوعات کو چھوئے بغیر کیسے مس کرتا ہے اور شاید اس طرح آرتھر کرسٹوفر کے does not اور has a touch کا مفہوم بھی واضح ہو جائے۔

الف۔ بحیثیت مورخ (As Historian)

"مین آف ایکشن ایک عجیب سی غلط فہمی میں مبتلا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ چیزوں کو درہم برہم کر کے ان کا مزاج بدل دے گا لیکن جونہی وہ اس بے کار حرکت سے فارغ ہوتا ہے تو اشیاء اپنی عادت کے مطابق پھر اپنی اصلی حالت میں آجاتی ہیں۔ ایسا ہی حادثہ اٹیلا attila کے ساتھ ہوا جب وہ اونچے اونچے پہاڑوں کو عبور کر کے اپنے ہاتھیوں سمیت روم پہنچا تو وہ سینٹ senate میں بھاری بھرکم سینٹرز کو پرسکوں بیٹھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔" (اٹھنا بیٹھنا، غلام جیلانی اصغر)

"بات بڑھاپے کی ہو رہی تھی یہ ذکر قیامت کہاں سے چھڑ گیا۔ بڑھاپے کی بھی اپنی قدر ہے۔ ٹرائے کی دس سالہ جنگ اور بیس سال کھلے سمندر میں بھٹکنے کے بعد جب یولیسز سفید داڑھی لہراتا ہوا تھکن سے چور گھر پہنچتا ہے تو جذبے کے لحاظ سے پہلے سے زیادہ جوان ہے۔ گھر بار، چولہا چوکا، بیوی بچے سب اسے بے عملی کی علامت نظر آتے ہیں۔" (بڑھاپا، حامد برگی)

"ہماری ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی بھی بجھتے ہوئے چراغ کی آخری انگڑائی تھی لیکن یہ انگڑائی ایسے وقت لی گئی جب بادشاہ ضعیف اور قوم

مضمحل ہو چکی تھی۔ نتیجتاً یہ انگڑائی پھیل کر نوے برس کو محیط ہو گئی۔ کتنی نسلیں اس صلیب پر آویزاں رہیں کتنے لوگوں نے اسے تاریخ کے دامن سے کھرچنے کی کوشش کی تب جا کر بہادر شاہ کے ہم قوم ہوئے کہ وہ لارڈ کلائیو کے جانشین سے اپنا اقتدار واپس لے سکیں۔" (انگڑائی، محمد اقبال انجم)

ب۔ بحیثیت فلسفی (As A Philospher)

"سچ بولنے کے باعث مجھے پاگل خانے میں پناہ ملی تو مجھے سچ بھی جھوٹ معلوم ہونے لگا اور یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی پر حقائق منکشف ہونے لگتے ہیں یعنی وہ حقائق کے غیر حقیقی پن سے متعارف ہونے لگتا ہے۔" (اے ہوشمندو، جوگندر پال)

جیمس کہتا ہے کہ "صداقت کسی تصور کو پیش آتی ہے۔" یعنی یہ کہ یہ تصور اس وقت صادق ہو جاتا ہے جبکہ وقوعات اس کو صادق بنا دیتے ہیں۔ شیلر کا کہنا ہے کہ "کسی صداقت کے لیے اس سے زیادہ کچھ اور درکار نہیں ہوتا کہ اسے ایک مخصوص صورت حال کے لیے۔ معقول اقدار کا حامل اور بامقصد ہونا چاہیے۔ (فلسفے کے بنیادی مسائل، قاضی قیصر اسلام، ص ۳۲۰:)

"میں اپنی ذات کو بیچ میں لے آیا ہوں۔ کیا کروں اپنی ذات کو بیچ میں لائے بغیر میں دنیا کی کسی حقیقت کا صحیح طور پر ادراک نہیں کر سکتا۔" (آوارہ خیالی، غلام الثقلین نقوی)

انسان کے سوچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کا وجود ہو۔ اس لیے تیقن کی اصل اساس یہ ہے کہ "اندیشم پس ہشتم" (میں سوچتا ہوں اس لیے میں ہوں cogito irgo sum) (تاریخ فلسفہ، کلیمنٹ سی جی ویب، ص ۱۱۱:)

"ناموجود سے موجود کی طرف سفر کا آغاز، ایک بے ہیئت، بے سمت، بے کنار صدا کی صورت میں ہوا تھا۔ ایک ایسی صدا جو اپنی ہی صدا کے تعاقب میں تھی اور پھر ایک نامعلوم لمحے میں اپنے آپ سے ٹکرائی اور لرزہ خیز دھماکے کے ساتھ ایک سے دو میں تقسیم ہو گئی اور یوں اس نے اپنے الگ وجود کا ادراک کیا اور پھر یہیں سے یہ سلسلہ در سلسلہ، صدا اندر صدا بڑھتی اور پھیلتی چلی گئی۔" (صدائے بازگشت، سلیم آغا قزلباش)

کائنات کی ابتدا کے بارے میں سائنس کی جدید ترین تھیوری بھی یہی ہے کہ کائنات ناموجود (nothing) سے جست کر کے وجود میں آئی۔ آئن سٹائن کے 'نظریے مقادیر' کا مطمع نظر بھی یہی ہے۔

ج۔ افسانے کا تاثر:

"میں بے بس ہو کر ڈور پر ڈور دیے جاتا ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے اگر ذرا بھی ڈور کر روکا تو میرا ہاتھ کاٹ دے گی، پلٹ کر پیچھے زمین کی طرف دیکھتا ہوں تو ڈور ختم ہوتی جا رہی ہے... میں کیا کروں اس چھنال کی آنکھیں سیر ہی نہیں ہوتیں... لحظہ بہ لحظہ ڈور میرے ہاتھ سے نکلتی جا رہی ہے... نکلتی جا رہی ہے۔" (پتنگ، اکبر حمیدی)

"ہم بڑے ہشیار ہو گئے ہیں۔ آنکھیں ترس جاتی ہیں کہ کوئی تو ایسا ملے جو اتنا ہوشیار، اتنا عیار نہ ہو۔ ہم اس پر ایک دم بھروسہ کر لیں اور اسے بے تحفظ، بے خوف، بے تامل گلے لگا لیں اور ہمارے پھٹے ہوئے سینوں میں قرار آ جائے... ارے کوئی تو احمق ہو، کوئی دیوانہ... کوئی محبت کرنے والا... مفت میں محبت کون کرے گا

بابا پہلے دام نکالو۔" (اے ہوشمندو، جوگندر پال)

"ایک دن چند لمحوں کے لیے میں نے اس پر سواری کی تھی مگر اس وقت بہت اندھیرا تھا۔ ایسا اندھیرا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ مجھے یہ تو لگا کہ وہ مجھے لے کر ایک غار نما راستے میں بہت دور نکل گیا ہے۔ اتنی دور کہ میدان دریا صحرا اور آسمان سبھی ختم ہو گئے ہیں مگر میں ابھی پوری طرح سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اچانک سورج میرے سامنے آ گیا اور میری آنکھیں بری طرح چندھیا گئیں۔ پھر جب میں نے آہستہ آہستہ دیکھنا شروع کیا تو میں وہیں کھڑا تھا جہاں سے تاریکی کا سفر شروع ہوا تھا۔" (گھوڑا اور میں، شہزاد احمد)

"پھر میں اس خواب کو بھول گیا مگر مدتوں تک گھوڑے کی ٹاپ میرے کانوں میں آتی رہی۔ اس کا پسینے میں نہایا ہوا جسم میرے روئیں روئیں کو چھو کر تیزی سے گزرتا رہا، میں نے بیداری کے عالم میں گھوڑے کو قتل کرنے کی کئی کوششیں کیں اور چند ایک میں کامیاب بھی ہوا مگر گھوڑا قتل ہونے کے بعد نیا سر اگا لینے پر قادر تھا۔" (گھوڑا اور میں، شہزاد احمد)

د۔ طنز و مزاح:

"آپ کسی معقول شاعر سے یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ خود ہی شعر بھی لکھے اور خود ہی اس پر عمل بھی کرے یہ تو بالکل ایسا ہی ہوا کہ آدمی شادی بھی کرے اور اس کے فوائد پر مضمون بھی لکھے۔" (اٹھنا بیٹھنا، غلام جیلانی اصغر)

"یہ اندر والے کے معمولی اشارے پر زبان دانی کا مظاہرہ پیچ چورا ہے پر کر سکتی ہے۔" (زبان، سلیم آغا قزلباش)

"اگر وہ (غالب) محبوب سے اجازت طلب کیے بغیر زبان کے جوہر دکھا کر اسے شرمسار کرنے کی زحمت فرماتے تو پھر شاید محبوب بھی بے چون و چرا ان سے غیر مشروط ناطہ جوڑنے پر راضی ہو ہی جاتا۔" (زبان، سلیم آغا قزلباش)

"میرا دوست 'ف' انسان نہیں فرشتہ ہے، اس کے کام بھی فرشتوں والے ہیں یعنی دوسروں کی برائیوں اور گناہوں کا حساب رکھنا۔" (بے کار رہنا، محمد یونس بٹ)

"نہیں شیطان کی کیا ہمت کہ ہماری سائنسی قوت کے سامنے دم مار سکے؟ اپنے بچاؤ کے لیے وہ جہنم کی سرحدیں پھلانگ کر ہماری مہذب دنیا میں ہی آ چھپا ہے۔ اس نے سوچا ہوگا حالات بہتر ہوتے ہی واپس چلا جاؤں گا مگر انسانی ترغیبوں کی تاب نہ لا کر اب وہ مستقلاً یہیں بس گیا ہے۔ ہماری انٹلی جنس کی پکی خبر ہے کہ وہ یہیں ہماری دنیا میں ہے۔ ہم اسے پکڑ تو لیں مگر ہماری اطلاع کے مطابق وہ اب اتنا جنٹل مین دکھتا ہے کہ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں اس کے دھوکے میں ہم اپنے ہی معززین میں سے کسی کو نہ دھر لیں۔" (اے ہوش مند، جوگندر پال)

"افسوس کہ مغلوں نے برصغیر میں کرکٹ رائج کرنے کے بجائے اپنا ٹھاٹھ ہی سمیٹ لیا اور برصغیر کا طویل و عریض میدان انگریزوں کے لیے خالی کر دیا تا کہ وہ ایل بی ڈبلیو ہو جانے کے خطرے کو خاطر میں لائے بغیر بے تحاشا کرکٹ کھیلیں۔ گیند کو معمولی سا بلہ دکھائیں اور جس سمت میں چاہیں پھینک دیں۔" (کرکٹ،

انور سدید)

''ممکن ہے وہ (نفسیات دان) میرے شعور اور لاشعور کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ صادر کر کے مجھے شرمندہ کر دے کہ میں نکٹائی باندھنے سے محض اس لیے گریز کرتا ہوں کہ ایسی صورت میں میں اپنی وہ وہ پرانی قمیص استعمال کرنے سے محروم ہو جاتا جس کے پھٹے ہوئے کالر پر مفلر پردہ ڈالے رکھتا ہے۔'' (نکٹائی، بشیر سیفی)

ح۔ انکشاف ذات:

انکشاف ذات کو انشائیہ کی دلالت وصفی یا تضمن connotation کہا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں ہوگا۔ انشائیہ نمبر کے تمام انشائیے انکشاف ذات کے وصف سے بھرپور ہیں تاہم چند ایک انشائیوں میں اس کا اظہار زیادہ شدید ہے۔ مثلاً:

''آپ مجھے ہی دیکھیں میں پچھلی دو دہائیوں سے ایک ہی جگہ بیٹھا ہوں اس لیے جب بھی 'ؤ میرا کسی سے تعارف کراتا ہے تو وہ یہ کہنا ضروری سمجھتا ہے ''یہ ہیں پروفیسر گل محمد جو پچھلے کئی سالوں سے ذہنی اور جسمانی طور پر ایک ہی مقام پر رکے کھڑے ہیں۔'' یہ تعارف بظاہر تو نیم سنجیدہ اور نیم طنزیہ ہوتا ہے لیکن اس سے ایک خاص قسم کی محبت اور یگانگت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ دراصل دو انسانوں کے درمیان ایک ایسے اعتماد کا اظہار ہے جو اس مفروضہ پر استوار کیا گیا ہے کہ انسان سیل رواں کی طرح نہیں بلکہ کوہ گراں کی طرح ہے۔ وقت اس کے اندر نقب تو لگا سکتا ہے لیکن اس کی وفاداریوں کے خدوخال کو نہیں بدل سکتا۔'' (اٹھنا بیٹھنا، غلام جیلانی اصغر)

''خدا کی نافرمانی میرے وجود میں کسی چھچھوندر کی طرح روزِ ازل ہی سے گھس بیٹھی ہے۔ میں اسے ڈھونڈ کر اپنے گھر سے باہر نکال دینے سے بھی قاصر ہوں۔ میں راتوں کی گہری تاریکی اور تنہائی میں اس کی الارم نما چک چک کی آواز سے ڈرتا ہوں۔'' (نافرمانی، محمد اسد اللہ)

''گھوڑا حسن اور رعنائی کی علامت بن کر ہماری زندگی میں ابھرتا ہے۔ اس لیے کہ اس سچ سے بنے ہوئے گھوڑے کی شبیہ کو فریم کرا کر میں نے اسے اپنے ڈرائنگ روم کی زینت بنا دیا ہے یقین کیجئے اس میں میری سنابری کا کوئی دخل نہیں یہ میری باطنی تمثیل کا آئینہ دار ہے۔'' (ڈرائنگ روم میں گھوڑا، جمیل آذر)

اب آئیے آخر میں ڈاکٹر وزیر آغا کی تعریف کی جانب۔ وزیر آغا صاحب کی تعریف کی جامعیت کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میں نے اس تعریف کے حوالے سے انشائیوں کا مطالعہ کیا اور پھر اقتباسات کے چناؤ کے لیے مجھے اس مشکل نے آن گھیرا کہ پورے کے پورے انشائیوں پر ہی مذکورہ تعریف منطبق ہوتی ہے تاہم مشتے نمونے از خروارے:

''انشائیہ اس تحریر کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیاء یا مظاہرے کے مخفی مفاہیم کو اس طرح گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آ کر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہوتا ہے۔'' (دوسرا کنارہ، وزیر آغا)

''ہر کتاب بھی اپنی تیسری آنکھ رکھتی ہے جو کسی ایسے قاری کی تلاش میں رہتی ہے جو اس کی روح معانی میں اتر کر اس کے پس منظر کے نشیب و فراز پر چہل قدمی کرے۔'' (تیسری آنکھ، جان کاشمیری)

”پیوستگی کا یہ عمل محض انسانوں تک محدود نہیں بلکہ اگر غور کیا جائے تو کائنات کی ہر جاندار اور بے جان چیز حسن معانقہ سے آشنا ہوتی ہے۔ گھڑی کی سوئیاں ڈائل کی گولائی میں سفر کرنے پر مجبور ہیں لیکن وہ وقت کے صحرائے بسیط میں سفر کرتے ہوئے ہر لفظ کے سنگ میل پر ایک دفعہ ضرور گلے ملتی ہیں۔ چیونٹیاں جب کسی مکان کے گوشے میں پڑے ہوئے رزق کے ذخیرے کو اپنے اپنے سوراخوں میں منتقل کرنے کا عمل شروع کرتی ہیں تو آمد و رفت کے دوران صورت احوال معلوم کرنے یا اظہار مسرت کے طور پر معانقے کو ضروری سمجھتی ہیں۔ دور افق پر زمین و آسمان کی معانقہ آرائی کا منظر کسی کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہوگا۔“ (معانقہ، محمد اقبال انجم)

”بعد ازاں جب انگریز قوم کی عادات و اطوار سے آگاہی حاصل ہوئی تو معلوم ہوا کہ چونکہ ان لوگوں کو اپنی اس سلطنت کی حفاظت کے لیے جس پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا جنگی مشقتیں کرنے کی اشد ضرورت ہے اس لیے وہ کھانے کی میز پر بھی اس سلسلے کو جاری رکھتے ہیں، سوان کے لیے کھانا جسم کو برقرار رکھنے کا بہانہ نہیں بلکہ دشمن کو زیر کرنے کا شاخسانہ ہے۔“ (دستر خوان، وزیر آغا)

”جہاں تک منڈیر پر بولنے والے کوے یا کاگ کی آواز کا تعلق ہے اسے مہمان کی آمد کا سندیسہ سمجھا جاتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں یہ کوا نہیں بول رہا ہوتا ہماری اداسی متشکل ہو کر منڈیر پر آبیٹھتی ہے۔“ (اداسی، منشا یاد)

”سمندر کو دیکھ کر میں فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اس میں پانی زیادہ ہے یا اداسی۔“ (اداسی، منشا یاد)

”میری آنکھیں مشرقی افق پر زرد زرد گول گول صاف اور شفاف بڑے صفر کر ابھرتے اور بلند ہوتے دیکھتی ہیں۔“

”یہ سارے ستارے اپنی اپنی جگہ صفر ہیں جو اس صفر سے اگر بڑے نہیں تو کسی صورت میں کسی مفہوم میں اس سے چھوٹے بھی نہیں۔“

”(صفر) جب بھوکے کے سامنے آتا ہے تو چپاتی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔“ (صفر، انجم نیازی)

”گول کیپر میں وہ تمام صفات پائی جاتی ہیں جو کسی بھی سپہ سالار میں ہوتی ہیں مثلاً سپہ سالار کی وردی عام فوج سے مختلف ہوتی ہے اور تمام حفاظتی تدابیر اس کی حفاظت کرتی ہیں۔ گول کیپر کی وردی بھی باقی ٹیم کے کھلاڑیوں کی وردی سے مختلف ہوتی ہے اور پوری ٹیم میں صرف وہی ہوتا ہے جس کے بدن کی حفاظت کے لیے بہت کچھ جتن کیے جاتے ہیں۔“ (گول کیپر، اظہر ادیب)

”ناک ایک اہم عضو ہی نہیں، ایک غیر معمولی معاشرتی سمبل (symbol) بھی ہے اگر آپ شریف آدمی ہیں اور اتفاق سے آپ کا ناک نقشہ اچھا نہیں ہے تو بھی معاشرے میں آپ کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جائے۔“ (ناک، نذیر احمد راہی)

”دو کواڑوں والا دروازہ ذہن میں پہلے سے موجود ترتیب اور توازن میں کوئی خلل پیدا نہیں کرتا جب کہ ایک کواڑ والا دروازہ اس توازن اور ترتیب میں نہ صرف خلل بلکہ انتشار پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے کہ اس کا مجرد وجود قانون فطرت کی صریح خلاف ورزی کے مترادف ہے۔“ (دروازہ، تقی حسین خسرو)

''سطحِ سمندر کا پانی بھی دراصل ایک نقاب ہے جس نے اس کے اندر کی ایک پوری دنیا کو چھپا رکھا ہے، پھر یہ دھرتی بھی ایک نقاب ہے جس کے اندر چھپے ہوئے پُر اسرار خزانے تمام تر معدنی اور آتش فشانی کے باوجود ابھی تک نقاب میں ہیں۔ اس سے بھی آگے دیکھیں تو یہ پوری کائنات ہی ایک نقاب ہے۔'' (نقاب، حیدر قریشی)

''ہم ظاہر داری کی سنگلاخ دیواریں تعمیر کرتے ہوئے نجانے کیوں یہ بات فراموش کر بیٹھے ہیں کہ ان دیواروں کے پہلو بہ پہلو ایسی بہت سی دیواریں بھی ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتیں مگر جو اتنی پائیدار ہیں کہ فطرت بھی انہیں گرانے سے قاصر رہتی ہے، ہر چیز کو اپنے ساتھ بہا کر لے جانے والا وقت کا ریلا ان سے سر پھوڑتا ہے مگر انہیں گرانے میں کامیاب نہیں ہوتا۔'' (دیوار، امجد طفیل)

''اجالے کی روشنی تو بڑی ظالم چیز ہے جو اشیاء کو بالکل ننگا کر دیتی ہے۔ چہرہ ہی نہیں روح تک کے داغ ابھر آتے ہیں۔ دوسری طرف اندھیرے کی روشنی میں سیدھی بے مہر لکیریں بھی نازک سی قوسوں کے روپ میں نظر آنے لگتی ہیں۔ نشیب و فراز کا فرق ملائم ہو جاتا ہے۔ حقیقت کی کرختگی خواب کی خستگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اجالے کی روشنی میں سائنس فلسفہ اور شماریات کو فروغ ملتا ہے۔ اندھیرے کی روشنی میں فنونِ لطیفہ کے بیج اگتے ہیں۔'' (آنکھیں، وزیر آغا)

ان تعریفوں سے قطع نظر انشائیوں میں اسلوب کی جو خوبیاں ہیں ان میں میں نے دو چیزیں شدت سے محسوس کیں۔ اول تلمیح کا استعمال، دوم اساطیر کے حوالے سے بات کو وسعت عطا کرنا۔ تلمیح بقول ڈاکٹر وزیر آغا ''تجربے خیال یا حکمت کو کیپسول میں پیش کرنے کا رویہ ہے۔'' (پہلا ورق، اوراق، مئی جون ۱۹۸۳ء)۔ تو ذرا ایک نظر انشائیوں میں تلمیح اور متھ کے خوبصورت استعمال پر بھی ڈالیے۔

تلمیح:

''ہماری دنیا کی دو سب سے ہوشمند قومیں ایک دوسرے کے خوف سے پاگل ہیں اور ان کے نمائندے کسی صلح جو مہم کے دوران جب گلے ملتے ہیں تو بیک وقت اپنی اپنی پیٹھ پر خنجر کی چبھن محسوس کر رہے ہوتے ہیں۔

(ہوشمند) کل دنیا کو ایک نیا درس دینے کی دھن میں اس قدر سرشار ہوتے ہیں کہ مقامی لوگ انہیں نہایت خطرناک پاگل سمجھ کر ان کے سامنے زہر کے پیالے رکھ دیتے ہیں جنھیں وہ مست فقیر میٹھا پانی سمجھ کر بے تامل ہاتھوں ہاتھ لے لیتے ہیں۔'' (اے ہوشمندو، جوگندر پال)

''میرے دل کے کسی گوشے میں کوئی آواز مجھے کہتی ہے تم سب کو جانتے ہو کیونکہ پیدائش کے وقت تمھیں سب چیزوں کے نام بتا دیے گئے تھے۔'' (آہٹ، شہزاد احمد)

''اس عالم میں مجھے ہمیشہ یوں محسوس ہوا ہے کہ وقت کے پر کٹ گئے ہیں یا جیسے ہم اصحاب کہف کے غار میں ارادۃً داخل ہو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے ہیں اور اپنی دنیا میں واپس آتے ہیں تو کیلنڈر اپنے پانچ اوراق الٹ ہو چکا ہوتا ہے اور دنیا کچھ اور بوڑھی ہو چکی ہوتی ہے۔'' (کرکٹ، انور سدید)

''روحانی اور شیطانی نعرے تو خیر روزِ ازل سے ہی ستیزہ کار رہے ہیں

جب کہ تاریخ عالم میں قم باذنی، اناالحق، لاتلذ جیسے مقدس، پاکیزہ اور مستانہ وار نعروں نے سوچ کے دھاروں کو ایک نئی ڈگر اور سمت عطا کی ہے۔" (نعرہ، ارشد میر)

"کئی بار میں نے سوچا کہ شاید ابتدا میں صرف 'آنکھ' تھی۔۔۔ ایک بے کنار، محیط و بسیط آنکھ جو خلا کو گھور رہی تھی پھر اچانک اس آنکھ کے اندر عکسوں کا لامتناہی سلسلہ موجزن ہو گیا۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ عکسوں کا یہ سمندر آنسوؤں میں ڈھل کر اپنے کناروں سے چھلک گیا اور پھر لاتعداد ستاروں اور سیاروں اور کہکشاؤں کی صورت بساطِ فلک پر چمکنے لگا تب آنکھ نے اسے دیکھا مسکرائی اور کہا: اچھا ہے!۔" (آنکھیں، وزیر آغا)

اساطیر (Myth):

یونانی دیومالا کے مطابق ققنس ایک خوش رنگ اور خوش آواز پرندہ ہے جس کی چونچ میں تین سو سات سوراخ ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک ایک راگ نکلتا ہے۔ جب اسے بھوک لگتی ہے تو کسی بلند پہاڑ پر ہوا کے رخ ہو بیٹھتا ہے جس کے سبب عجیب و غریب سر نکلتے ہیں اور ان کی آواز پر بہت سے پرندے فریفتہ ہو کر اکٹھے ہو جاتے ہیں اور ان میں دو چار کو پکڑ کر چٹ کر جاتا ہے۔ اس کی عمر ہزار سال ہوتی ہے۔ ہزار برس گزرنے کے بعد یہ بہت سی سوکھی لکڑیاں جمع کرتا ہے اور ان پر بیٹھ کر مستی کے عالم میں گاتا اور پروں کو جھڑجھڑاتا ہے۔ جس وقت دیپک راگ اس کی چونچ سے نکلتا ہے تو لکڑیوں کو آگ لگ جاتی ہے اور یہ جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ اس راکھ پر جب مینہ برستا ہے تو اس میں سے از خود انڈہ پیدا ہوتا ہے اور انڈے سے ققنس دوبارہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس دیومالائی واقعے کو دو مختلف انشائیہ نگاروں نے اپنا مفہوم واضح کرنے کے لیے دو مختلف انداز سے استعمال کیا ہے۔

"پھر یہ کہ چند صدیاں بتانے کے بعد زبان ققنس کی طرح اپنی ہی راکھ سے نیا جنم لیتی ہے اس طرح تاریخ کے نشیب و فراز بھی اس کی زبانی ہم تک پہنچے ہیں۔" (زبان، سلیم آغا قزلباش)

"جوانی کے دور کا انسان بھی ققنس ہوتا ہے۔ جوانی گزرنے کے بعد خواہش کرتا ہے کاش وہ اپنی راکھ سے دوبارہ زندہ ہو سکے۔" (بڑھاپا، حامد برگی)

"جب میری گم گشتہ جنت میری ذات کی تجریدی صورت میں میرے سامنے آ گئی تھی تو میں نے طرح طرح کی جنتیں آباد کیں اور ان میں بڑے ہی خوبصورت دیوتاؤں کو لا براجمان کیا۔ کوئی جنت اولمپس کی چوٹی پر آباد ہوئی اور کوئی زمین کے پاتال میں، کسی دیوتا نے چاند میں بسیرا کیا اور کوئی سورج کے رتھ (یونان کا اپالو، سمریا کا شمس، بابل کا مردوخ، مصر کا آمن روح، ایران کا متھرا، ہند کا سریا) پر سوار صبح کی شفق سے برآمد ہوا اور شام کی شفق میں جا ڈوبا پھر ان کے ساتھ دیویاں بھی تخلیق ہوئیں۔ نرم و نازک صبا (فلورا دیوی) و نسیم سے بھی زیادہ لطیف اور شبنم (ایوس eos دیوی) کے قطرے سے بھی سبک خرام، کوئی سمندر کی جھاگ (یونان کی ہیرو ڈیتی دیوی) سے برآمد ہوئی اور کسی نے زمین کی کوکھ (یونان کی دیتر، مصر کی عزا، ہند کا درگا، روم کی سریس ماتا) سے جنم لیتا۔" (آوارہ خیال، غلام الثقلین نقوی)

کون ولسن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

روزمرہ کی زندگی اس جنگلے کی مانند ہے جس میں ہر سلاخ کے بعد

ایک باریک سی درز ہوتی ہے اگر آپ رک کر درز کے ساتھ ساتھ اپنی آنکھ لگا کر دیکھیں تو آپ کو جنگلے کے دوسری طرف کا ایک محدود حصہ نظر آئے گا لیکن اگر آپ سائیکل پر سوار ہو کر تیز رفتاری سے جنگلے کے پاس سے گزریں تو تمام درزیں یکجا ہو جائیں گی اور آپ کو جنگلے کے پار کا پورا منظر دکھائی دے گا۔"

دیکھا جائے تو یہ بات انشائیہ پر بھی صادق آتی ہے لیکن اس جزوی اختلاف کے ساتھ کہ یہاں ہمیں جنگلے سے پار کا مکمل منظر دیکھنے کے لیے کسی سائیکل کی ضرورت نہیں پڑتی۔ انشائیہ ہماری فکر کو مہمیز لگا دیتا ہے۔ رفتار خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ اجزا باہم مدغم ہو کر 'کل' کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ بقول پروفیسر جمیل آذر:

"انشائیہ زندگی کو اکائیوں میں بٹی ہوئی نہیں دیکھتا بلکہ اسے کلیت کے ساتھ قبول کرتا ہے۔" (اوراق، مئی جون ۱۹۸۳ء، انشائیہ زندگی سے مربوط)

(ماخوذ: ماہنامہ اوراق، خاص نمبر، مارچ اپریل، ۱۹۸۶ء، ص ۸۶:)

OOOO

اکبر حمیدی

انشائیہ کیوں اور کیسے؟

اگر سوال یہ ہو کہ انشائیہ کیوں؟ تو میرا جواب ہوگا انشائیہ کیوں نہیں!

ویسے میرا خیال ہے کہ 'کیوں' کا لفظ وہ پہلا لفظ ہے جسے انسان نے سن شعور کو پہنچتے ہی زبان سے ادا کیا ہوگا۔ اگر ایسا ہے تو میں اسے انسان کی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ اس نے 'کیوں' کے لفظ سے نہ صرف اپنے شعور کا اعلان کیا بلکہ اپنی اس عظمت اور احساس برتری کا بھی اعلان کیا ہو۔ 'کیوں' کے لفظ میں پوشیدہ ہے اور جو 'کیسے' کے لفظ میں نہیں۔ 'کیوں' میں مسترد کرنے والی بے پناہ قوت کا اظہار ہے جبکہ کیسے میں محض استفسار جھلکتا ہے۔ میرا خیال ہے جب بھی کوئی نئی ہیئت انسان کو دکھائی دیتی ہے وہ کیوں کے ذریعے اس کا جواز بھی تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس کے منظر، پس منظر اور پیش منظر میں بھی جھانکتا ہے اور پھر اسے قبول یا مسترد کرتا ہے۔ ادب میں بھی یہی صورت حال ہر دور میں پیش آتی ہے اور میرے خیال میں یہ ایک مثبت اور فعال صورت حال ہے۔ ادب میں جب بھی کوئی صنف آغاز ہوئی ہے، کوئی تحریک چلی ہے، کوئی نیا خیال، کوئی نئی صورت، نیا تجربہ پیش آیا ہے 'کیوں' کا لفظ ابھر کر پھر سے سامنے آ گیا ہے۔

اس سوال کا جواب تلاش کرنا بے حد اہم اور ضروری ہے، ویسے ہی جیسے کبھی آزاد نظم کیوں؟ علامتی و تجریدی کہانی کیوں؟ جیسے سوالات اٹھائے گئے تھے۔

بات یہ ہے کہ ہمارے ادب کی کہانی ہمارے سماج کی کہانی ہے! ایک وقت تھا جب ہمارا سماج پنگھوڑے میں لیٹا خواب گوں آنکھوں سے چاند کو دیکھ دیکھ کر مسکراتا رہتا تھا۔ جب وہ روتا تھا تو رونے کا باعث بتا نہیں پاتا تھا، ہنستا تھا تو ہنسنے کا سبب بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت ہمارا ادب بھی ایسا ہی تھا۔ وہ روتا بھی تھا ہنستا بھی تھا مگر رونے ہنسنے کے سرچشموں سے یا تو واقف نہیں تھا یا اسے بیان کرنے کی قوت نہیں رکھتا تھا، ہماری ابتدائی شاعری کے نمونے میرے بیان کی گواہی دیں گے، پھر جب سماج غوں غاں سے آگے بڑھا تو دادی اماں کی آغوش میں جا چھپا۔ تب اس کی بیدار ہوتی ہوئی حیات کو دادی اماں کی کہانیوں نے تھپک تھپک کر سلانے کی کوشش کی، یہ جنوں، پریوں،

دیوؤں، بادشاہوں، شہزادوں اور شہزادیوں کے قصوں کا زمانہ ہے، پھر جب نوجوانی کا خون لہریں لینے لگا تو شاعری خصوصیت سے غزل اور مثنوی نے دھومیں مچادیں، مذہب کے حوالے سے مقدس انسانی کردار ناٹک کے ذریعے میں رواج پائے۔ اسی طرح سماج پر مسلسل زوال، کم علمی اور غیر ملکی تسلط نے ایک طویل عرصے تک ادب کو علمی اور سیاسی شعور سے محروم رکھا۔

نئے خیالوں، نئے جذبوں، نئے تجربوں اور عصری علوم کو ادبی آہنگ میں لانے کے لیے جہاں مروجہ اصناف میں ہیئت کی تبدیلیاں آئیں وہاں انشائیہ جیسی نئی اصناف کو آغاز بھی ہوا۔ یہ بات نہ صرف نئی اصناف کے پھلنے پھولنے کے لیے بھی ضروری تھی بلکہ ان حقائق سے ہمارے تخلیق کاروں کی تخلیقی سچائیوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

شاعری کے ذریعے سے ہمارے سماج نے اپنے شعری آہنگ کا اظہار کیا۔ کہانی کے وسیلے سے اس نے اپنے تجربوں اور وقوعوں کا بیان قلم بند کیا۔ ڈرامے کے ذریعے اس نے اپنے مزاج کے ڈرامائی عنصر کو ظاہر کیا، غزل نے جگر لخت لخت کا نام پایا، نظم نے اس کے ذہنی اور فکری تسلسل کا ثبوت فراہم کیا۔ سفرنامے اس کے شوق سیاحت کی کہانی بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح حمد و نعت، مرثیہ قصیدہ نے اس کے فطری رجحانات اور ہنگامی ضرورتوں کو تسکین بخشی۔ یہی حال باقی چھوٹی موٹی اصناف کا ہے!

ہاں اگر کسی چیز کا اظہار نہیں ہو رہا تھا تو وہ ہمارے سماج کے انٹیلکٹ کا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس وقت تک ہمارے سماج کی ذہنی سطح یا علمی سطح اس بڑے معیار تک نہیں پہنچتی تھی جہاں اس کا انٹیلکٹ اظہار کی ضرورت محسوس کرتا کیونکہ یہ انسانی مزاج کا لازمی حصہ ہے کہ جب بھی اس کی کسی حس نے اظہار کی ضرورت محسوس کی ہے اس نے اظہار کے راستے تلاش کر لیے ہیں، رائج اصناف میں تجربے اور نئی اصناف کے رواج سب سماجی اظہار کے تقاضے تھے جو اپنے اپنے وقت پر پورے ہوئے۔ گزشتہ نصف صدی کے علوم و فنون نے ہمارے سماج کی ذہنی سطح کو جس تیزی سے سربلند کیا ہے انشائیہ اس کے انٹیلکٹ کے اظہار کا نام ہے۔ یہی اس کی ضرورت ہے، یہی اس کا جواز اور یہی انشائیہ کیوں کا جواب ہے! آج کا عہد ہمارے سماج کے انٹیلکٹ کا عہد ہے اس لیے مجھے کہنے دیں کہ یہ انشائیے کا عہد ہے، اس میں کچھ شک نہیں کہ اس انٹیلکٹ کا اظہار نظم، غزل، فکشن اور ڈراما تک میں ہو رہا ہے مگر انٹیلکٹ ان میں سے کسی صنف کا بنیادی عنصر یا پہچان نہیں ہے، انشائیہ ہی ایک ایسی صنف ادب ہے جو آج کے انٹیلکٹ کے اظہار کی خاطر معرض وجود میں آئی ہے!۔۔۔انٹیلکٹ سے میری مراد وہ غیر معمولی ذہانت ہے جو چیزوں کو نئے زاویے سے دیکھتی ہے۔ ایسے نئے زاویے سے دیکھتی ہے جس سے نیا خیال یا پرانے خیال کا نیا پہلو ابھر کر سامنے آتا ہے، انشائیہ کی بنیاد اور پہچان اس کا نیا خیال ہے، نیا تجربہ ہے، نیا مشاہدہ ہے، نیا جذبہ ہے، نئی کیفیت ہے۔ یہ ساری باتیں دراصل نئے خیال ہی کی ضمن میں آتی ہیں، اب یہ تخلیق کار کا کمال ہے کہ وہ اس نئے خیال کو کس انداز میں پیش کرتا ہے؟ جتنے نئے، دلکش، مؤثر اور بلند سطحی انداز میں وہ اپنی بات کہے گا اتنا ہی بڑا انشائیہ نگار بن کر سامنے آئے گا۔

انشائیے کے بارے میں میرے کچھ ذاتی خیالات ہیں جن کا اظہار اس موقع پر ضروری ہے کیونکہ یہ بھی انشائیہ کیوں کے جواب میں ہیں، مثلاً انشائیہ کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں پرتیں نہیں کھولی جاتیں بلکہ اس میں موضوع کے مختلف پہلو پیش کیے جاتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ محض کسی موضوع کے چند پہلو گنوا دینا انٹیلکٹ کا اظہار نہیں ہے، انشائیہ نگار کی منصب تو یہ ہے کہ وہ آئس برگ کے اس بڑے حصے کی بھی ہمیں سیر کرائے جو ہمیشہ پانی میں ڈوبا رہتا ہے اور اس طرح ہماری نظروں سے اوجھل رہتا ہے، گویا انشائیہ نگار موجود کو وجود میں لاتا ہے، ایک ایسے موجود کو جو موضوع کی پرتوں کی تہہ در تہہ گہرائیوں میں پوشیدہ ہے یا خود انشائیہ نگار کے انٹیلکٹ کا حصہ ہے، میرے خیال میں انشائیہ سطح پر پھیلتا یا بکھرتا کم ہے بلندی کی طرف جست اور گہرائی میں غوطہ زیادہ لگاتا ہے!!

انشائیہ کولوز سیلی آف مائینڈ یا آزاد ترنگ کے نام بھی دیے گئے ہیں، اس انداز فکر کے نتیجے میں انشائیے کو ایک غیر سنجیدہ بلکہ غیر معقول صنف ادب سمجھ لیا گیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ انشائیہ زندگی کے پر مسرت لمحوں کی پیداوار ہے یا انسان کے داخل کو محض نشاطیہ کیفیتوں کو پیش کرتا ہے جس کے نتیجے میں انشائیہ کو ایک غیر متوازن کہہ کر نظر انداز کرنے کا رجحان پیدا ہونے لگا، اس طرح ابتدائی دور میں انشائیہ کے مضحکہ خیز عنوانات نے بھی انشائیے کو ہدف مذاق بنایا، میں سمجھتا ہوں کہ دوسری اصناف کی طرح انشائیہ بھی زندگی کی تمام نشاطیہ اور حزنیہ کیفیتوں کا آئینہ دار ہے اور اسے کسی ایک کیفیت یا چند موضوعات تک محدود کرنا ممکن نہیں۔ گزشتہ ربع صدی میں انشائیہ نے جس تیزی سے اپنا ارتقائی سفر جاری رکھا ہے اور مقبولیت کی منزلیں طے کی ہیں، اس کے پیش نظر اسے مستقبل کی بڑی اور سب سے بڑی نثری صنف ادب کہنا چاہیے۔ انشائیہ اس نوجوانی کے عالم میں بھی بہت سی پرانی اور ترقی یافتہ نثری اصناف سے آگے نکل گیا ہے۔ خصوصیت سے نئی نسل نے اس صنف کو کھلے بازوؤں سے خوش آمدید کہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انشائیہ نے خیال کی تازگی، انداز نقطہ کے نئے پن اور اسلوب بیان کی بلندی مگر غیر پیچیدگی کے باعث نئی نسل کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ لیا ہے!

انشائیہ کا وجود تو ادب کے لیے ہوا کا تازہ جھونکا ہے۔ آج کے زمانے میں معقولات اور مسلمات نے ہر شعبۂ حیات میں کلیشے بنا دیئے ہیں، انشائیہ مسلمات، معقولات اور روایات کی شکست اور آزاد خیال کے احیا کی خاطر معرض وجود میں آیا ہے، دوسری اصناف ادب میں تقریر کی لذت اس بات میں ہے کہ تخلیق کار ہمارے دل کی بات کرے اور ہم سن کر یہ محسوس کریں کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا لیکن آنکہ در گفتار فخر تست آں ننگ منست کے مصداق انشائیہ میں قاری کے دل کی بات کہنا انشائیہ کو دوسرے درجے کا بنا دیتا ہے۔

چنانچہ میں سمجھتا ہوں آج کے فکری جمود کے عہد میں انشائیہ نئی نسل کو غور و فکر کے نئے راستے دکھائے گا اور نئی نسل کے انٹیسلک کی ذہنی سطح کو مزید بلند کرے گا۔

آج کا اعلیٰ تعلیم یافتہ، مہذب اور نئے دور کا انسان اپنے سے باہر ہی نہیں اپنے اندر بھی ایک زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ فکری سطح پر بھی زندگی کر رہا ہے بلکہ سچ پوچھئے تو آج کل کے انسان کی اصل زندگی تو وہ ہے جو وہ فکری سطح پر بسر کر رہا ہے، بعض اوقات تو وہ خارجی زندگی کا تحفظ بھی اپنے فکر و فلسفہ کے ذریعے کرتا ہے، میں سمجھتا ہوں اس فکری زندگی کی بقا کے لیے انشائیہ آج کے دور کی ضرورت ہے۔

انشائیے کے بارے میں اگرچہ مضامین کی صورت میں بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر ابھی بہت کم کتابیں سامنے آئی ہیں اس لیے ابھی تک وہ گرد باقی ہے جو ابتدا میں ہر صنف ادب پر پڑی ملتی ہے اب بھی جونہی انشائیے کا خیال آتا ہے عام بلکہ خاص قاری کے ذہن میں بھی کچھ سوالات ابھرتے ہیں، مثلاً انشائیہ کیا ہے؟ اس کا آغاز کب ہوا؟ انشائیے میں اور ایک عام مضمون میں کیا فرق ہے؟ کیا انشائیہ کسی آئیوری ٹاور میں بیٹھ کر لکھا جاتا ہے اور اس کا اپنے عصر سے اور اس کے مسائل سے کوئی رابطہ نہیں ہوتا؟ کیا یہ غیر سنجیدہ گفتگو کا نام ہے؟ آج کا انشائیہ اردو ادب میں کیا اضافہ کر رہا ہے؟ وغیرہ۔

انشائیے کے ناقدین کے طور پر یوں تو بے شمار نام آئے ہیں جنھوں نے دو ایک مضامین لکھ کر بھی انشائی تنقید میں اپنا حصہ ڈال دیا مگر جن حضرات نے اس موضوع پر کتابیں لکھیں ان میں ڈاکٹر وحید قریشی (اردو کا بہترین انشائی ادب)، مشکور حسین یاد (ممکنات انشائیہ)، ڈاکٹر سلیم اختر (انشائیہ کی بنیاد) اور ڈاکٹر انور سدید (انشائیہ اردو ادب میں) کے نام شامل ہیں۔ مضامین لکھنے والوں میں ڈاکٹر وزیر آغا، مشتاق قمر، محمد ارشاد، عرش صدیقی، غلام جیلانی اصغر، نظیر صدیقی، احمد جمال پاشا، ڈاکٹر سید محمد حسین، سجاد نقوی، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی، ڈاکٹر جاوید وششٹ، اختر اورینوی، رشید امجد، جمیل آذر، مرزا حامد بیگ، انور سدید، حامد برگی، سلیم آغا اور بہت سے لوگوں کے نام شامل ہیں۔ بشیر سیفی نے انشائیے پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی مگر ابھی یہ مقالہ کتابی شکل

میں سامنے نہیں آیا، اس کے کچھ حصے اوراق، ماہ نو وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں۔ انشائیے کی بحث میں ڈاکٹر وزیر آغا کا حصہ خاصا نمایاں ہے ایک تو اس لیے کہ انشائیے کا جو تصور ڈاکٹر وزیر آغا نے دیا اور پھر اپنے موقف کی حمایت میں جو مسلسل مضامین لکھے وہ سب سے زیادہ زیر بحث آئے، یوں ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیے کی بحث کو جاری رکھنے اور اسے آگے بڑھانے میں ذاتی طور پر بھی اور اپنے رسالے 'اوراق' کے ذریعے بھی نمایاں حصہ لیا۔

یوں تو انشائیے کی تعریف میں انگریزی اور اردو میں اتنا کچھ کہا گیا ہے کہ اگر سب کو یہاں پیش کر دیا جائے تو ہماری گفتگو کسی اور طرف چل نکلے گی۔ ضمناً یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ابھی تک بہت سی اصناف ادب بلکہ خود ادب کی تعریف پر تمام ناقدین کا اتفاق رائے نہیں ہو سکا مگر وہ اصناف بھی لکھی جا رہی ہیں اور مقبول ہو رہی ہیں اور تو اور غزل جیسی بڑی بلکہ سب سے بڑی اور سب سے مقبول صنف کی تعریف اور معیاروں پر ابھی تک اختلاف رائے چلا آ رہا ہے۔ سو اگر انشائیے کی تعریف پر اختلاف رائے چلا آ رہا ہے تو یہ ایک معمولی اور فطری بات ہے اس سے صنف انشائیہ پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ اب تک جو تعریف سب سے زیادہ قابل قبول ثابت ہوئی اور جس کو پیش نظر رکھ کر نیا انشائیہ لکھا جا رہا ہے وہ ڈاکٹر وزیر آغا کی پیش کردہ ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

> ''انشائیہ اس نثری صنف کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیا یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طور گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آ کر ایک نئے مدار کو وجود میں لاتے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔''

انشائیہ کا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اسے کس طرح تاریخی، تنقیدی، اصلاحی، فلسفیانہ، سائنسی مضامین سے الگ کیا جائے؟ یہ مسئلہ پیش آنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم ابھی تک انشائیے کو انگریزی 'ایسے' کے طور پر پیش کرتے چلے آ رہے ہیں چونکہ انگریزی میں ہر قسم کے مضامین کو 'ایسے' کہا جاتا ہے اس لیے انشائیہ کے بارے میں ایک سطح پر یہ ابہام ابھی تک چلا آ رہا ہے۔

ہمارے بعض ناقدین نے انگریزی کے 'پرسنل ایسے' یا 'لائٹ ایسے' یا دونوں کی امتزاجی کیفیت پر مشتمل تحریر کو انشائیہ باور کروانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ انشائیہ میں واحد متکلم یعنی 'میں' کے صیغے میں بات کی جائے تو وہ انشائیے کا اسلوب ہوگا۔ میرے نزدیک واحد متکلم کے صیغے میں بات کرنا کافی نہیں بلکہ انشائیے میں ذاتی خیالات و رجحانات، ذاتی جذبات و کیفیات کا اظہار بھی ضروری ہے۔ 'میں' کا صیغہ استعمال کر کے کوئی اگر عامیانہ، سنی سنائی یا پڑھی پڑھائی باتیں کرتا رہے تو وہ انشائیہ نہیں بنے گا۔ اس طرح 'لائٹ ایسے' سے مراد یہ لیا گیا ہے کہ مزاحیہ یا غیر سنجیدہ لب و لہجے میں بات کی جائے۔ اس تاثر نے انشائیے کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ مزاحیہ اور غیر سنجیدہ روش بعض اوقات انشائیے کی ضرورت بن جاتی ہے۔ جب کوئی سخت بات، سنجیدہ لب ولہجہ میں کہنا تہذیب و اخلاق کے منافی ہو یا معانی کی سنجیدگی اور گراں باری کو قابل برداشت بنانا مقصود ہو تو ہلکا پھلکا شگفتہ، مزاحیہ یا غیر سنجیدہ اسلوب اختیار کیا جاتا ہے۔ تاہم مزاح، طنز، غیر سنجیدگی انشائیے کے ضمنی اور وقتی عناصر ہیں جنھیں حسب ضرورت ہی استعمال کیا جانا چاہیے۔ انشائیہ بنیادی طور پر نئے خیالات، نئے علوم، نئے انداز فکر اور نئی کیفیات پیش کرنے کی صنف ہے جن کا کم سے کم معیار یہ ہے کہ ایسی تحریریں پڑھ کر ہمیں محسوس ہو کہ ان باتوں کی طرف ہمارا دھیان نہیں گیا تھا۔

مختصر یہ کہ انشائیہ انگریزی 'ایسے' سے مختلف قسم کی چیز ہے۔ بے شک اسے انگریزی 'ایسے' ہی کو دیکھ کر شروع کیا گیا مگر اردو میں آ کر اس نے نئے دیس کا بھیس اختیار کر لیا۔ یہی اس کی مقبولیت کا باعث بھی بنا۔ . . کسی تنقیدی، سائنسی، سیاسی، فلسفیانہ مضمون میں اور انشائیے میں بنیادی امتیاز یہ ہے کہ ان تمام مضامین کو لکھنے والا براہ راست اپنے علم و فضل اور معلومات کا اظہار کرتا ہے اور اپنے موضوع سے سر مو انحراف نہیں

کرتا جبکہ انشائیہ میں انشائیہ نگار ایک موضوع کے حوالے سے اس کے ساتھ منسلک بے شمار موضوعات پر آزادی سے مگر منضبط انداز میں خیال آرائی کرتا ہے اور ہرگز قاری کو احساس نہیں ہونے دیتا کہ وہ اپنے علم وفضل کا اظہار کر رہا ہے حالانکہ وہ دراصل اپنے علم وفضل ہی کا اظہار کر رہا ہوتا ہے، انشائیے میں علم وفضل کو جس صورت میں پیش کیا جاتا ہے اس کی جھلک مرزا یاس یگانہ کے اس شعر میں دکھائی دیتی ہے:

علم کیا علم کی حقیقت کیا
جیسی جس کے گمان میں آئی

انشائیے کا آغاز کب ہوا؟ یہ ایک اور اہم سوال ہے جس پر بہت کچھ لکھا گیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی 'اردو کا بہترین انشائی ادب' میں کہتے ہیں کہ انشائیے کا آغاز محمد حسین آزاد سے ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے آزاد، نذیر احمد، سرشار، سرسید، ابوالکلام آزاد اور رستم کیانی اور بہت سے دوسرے مضمون نگاروں کو انشائیہ نگار قرار دیا ہے جن کے مضامین میں انشائی عنصر ملتے ہیں۔ اس ضمن میں کچھ ایسے ہی خیالات مشکور حسین یاد، ڈاکٹر سلیم اختر، محمد ارشاد کے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے اپنی کتاب 'انشائیہ اردو میں ادب میں' باب چہارم سے باب ہفتم تک چار ابواب میں اس موضوع پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح انشائیہ باب ہفتم میں آکر جو موجودہ زمانہ ہے پورے خدوخال کے ساتھ سامنے آیا۔ ان کے خیال میں مندرجہ بالا حضرات کے ذہن میں انشائیے کا کوئی واضح تصور موجود نہیں تھا البتہ انھوں نے تراجم و اخذ کے ذریعے اچھے شگفتہ مضامین تحریر کیے ہیں۔ یہ موقف حقیقت سے زیادہ قریب ہے اگرچہ نامکمل ہے۔ اس سے انشائیے کی نمود سے اب تک تدریجی سفر کی منازل کا اندازہ سا ہوتا ہے۔

انشائیے کا اردو میں آغاز کس نے کیا؟ یہ سوال بھی ایک اہم سوال ہے اور عرصے سے زیر بحث چلا آ رہا ہے۔ اس ضمن میں عمومی رائے یہی تھی کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے اردو میں سب سے پہلے انشائیہ لکھنا شروع کیا۔ اس خیال کو یہ کہہ کر مسترد کیا جاتا رہا کہ انشائیہ تو محمد حسین آزاد ہی سے لکھا جانے لگا تھا۔ چنانچہ محمد حسین آزاد سے ابوالکلام آزاد تک بہت سے مضمون نگاروں کو انشائیہ نگار کہا جاتا رہا۔ مغرب میں اب مونتین کو انشائیے کا بانی تسلیم کر لیا گیا ہے مگر انگریزی ادب کا مطالعہ کر کے آپ حیران ہوں گے کہ مونتین کے خلاف بالکل یہی موقف اختیار کیا گیا جو ڈاکٹر وزیر آغا کے خلاف اختیار کیا گیا۔ جب مونتین کو انشائیہ کا موجد قرار دیا گیا تو great essays of all nations کے مرتب ایف ایچ پریچرڈ نے کہا کہ یہ تو 'ایسّے' کی قدیم صنف ہے۔ تب اس نے افلاطون اور ارسطو اور فراسٹس تک کی تحریروں میں انشائیے کے نمونے ڈھونڈ نکالے۔ چنانچہ ایک عرصے تک گرد اڑتی رہی مگر پھر آہستہ آہستہ مونتین کو پہلا انشائیہ نگار تسلیم کر لیا گیا کیونکہ انشائیہ اپنے پورے خدوخال سمیت سب سے پہلے مونتین ہی کے ہاں نظر آیا۔ اردو میں بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا سے پہلے کے مضمون نگاروں کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ علی اکبر قاصد، داؤد رہبر، جاوید صدیقی نے جو مضامین لکھے ان کی صورت حال بھی ان کے پیش رووں سے زیادہ مختلف نہیں۔ میرے خیال میں جن بنیادوں پر مونتین کو انشائیے کا موجد قرار دیا جاتا ہے انہی بنیادوں پر ڈاکٹر وزیر آغا کو اردو انشائیے کا موجد تسلیم کیا جا سکتا ہے، اس بات کا دوسرا رخ یہ ہے کہ آج نئی نسل نے جس انشائیے کو قبول کیا ہے اور جس کے تتبع میں انشائیہ نگاری شروع کی ہے یہ وہی انشائیہ ہے جو ہمیں ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے تین مجموعوں: خیال پارے، چوری سے یاری تک اور دوسرا کنارہ میں دیا ہے۔

موجودہ انشائیہ نگاروں میں نئے اور پرانے سبھی نام دکھائی دیتے ہیں۔ چند نام دیکھیے : ڈاکٹر وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، مشکور حسین یاد، شہزاد احمد شہزاد، جمیل آذر، مشتاق قمر، انور سدید، سلیم آغا قزلباش، رام لعل نابھوی، حامد برگی، حیدر قریشی، بشیر سیفی، ارشد میر، محمد اسد اللہ، یونس بٹ، رعنا تقی، سعشہ خان، جان کاشمیری، امجد طفیل، محمد اقبال انجم، محمد اسلم، محمد اسلام تبسم، اظہر ادیب، شمیم ترمذی اور بہت سے دوسرے۔

انشائیے کے بارے میں ایک سوال پتہ نہیں کیوں مگر اکثر ابھرتا رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا انشائیہ عصری مسائل کو پیش کرتا ہے، یا کسی آئیوری ٹاور میں بیٹھ کر لکھا جاتا ہے۔ اس کا ایک جواب تو سلیم آغا نے 'اوراق' کے انشائیہ نمبر میں یہ کہہ کر دیا تھا:

> ''سو یہ کہنا انشائیہ 'عصری آگہی' کے جوہر سے تہی ہے ایک لایعنی بہتان ہے البتہ یہ سوال ضرور قابل غور ہے کہ انشائیہ نگاروں نے عصری مسائل کے کینوس پر کون کون سے رنگوں کو ابھارنے کی کوشش کی ہے، اور وہ اس مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔''

اس سوال کا دوسرا جواب یہ ہے کہ موجودہ انشائیوں میں سے کچھ اقتباسات پیش کیے جائیں جن سے اس سوال کے جواز یا عدم جواز کو ثابت کیا جا سکے۔ سو چند اقتباسات حاضر ہیں:

> ''اگر سپر طاقتیں اپنے اس نیک مشن سے دست کش ہو جائیں تو بہت سی جنگوں اور بکھیڑوں سے گلوخلاصی حاصل ہو سکتی ہے لیکن سپر طاقتیں بھلا گھاٹے کا سودا کیوں کریں جس میں چودھراہٹ کے چھن جانے کا خطرہ ہو۔''(انشائیہ: گلی، سلیم آغا قزلباش)

> ''مسٹر رائٹ مین اختلاف رائے کو برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ بڑی بڑی خشمگیں آنکھیں نکال کر بڑے جوش سے بولا کہ مہنگائی نام کی کوئی شے نہیں ہے۔ یہ سب ہمارا واہمہ ہے۔''(انشائیہ : مسٹر رائٹ مین، جمیل آذر)

> ''اس نے دیکھا کہ قصیدے نے خوشامد اور مبالغہ آرائی کے علاوہ دست طلب دراز کرنے کی عادت بھی اپنا رکھی ہے سو اس نے ان تینوں کی مذمت کو اپنا شعار بنا لیا۔ قصیدہ زہد و اتقا، عظمت و جبروت، بہادری اور فیاضی ایسی صفات کو پسند کرنے کا عادی تھا۔ غزل نے زہد کو للکارا۔ عظمت و جبروت کا منہ چڑایا۔''(انشائیہ :غزل، وزیر آغا)

> ''اگر کوئی آدمی آپ کے نیچے سے سیٹ کھینچ لے تو یہ عمل آپ کی ذات کو توڑ دے گا لیکن اگر آپ خود ہی خوش دلی سے اٹھ کر ذرا پیچھے زیادہ آرام دہ سیٹ پر بیٹھ جائیں تو یہ عمل باوقار بھی ہوتا ہے اور خوسگوار بھی۔''(انشائیہ : تسخیر کائنات، غلام جیلانی اصغر)

> ''اب ان کے ناموں کی تختیاں اتاری اور نئی نصب کی جا رہی ہیں۔ حیرت ہے سڑکیں جن ناموں سے منسوب ہوتی ہیں ان ناموں سے دوام حاصل کرنا نہیں چاہتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نام ان سڑکوں سے دوام حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سڑکیں شاید زمانہ اور حالات کی دستبرد کا اس قدر شکار نہ ہوں جتنا ان ناموں کی مالک شخصیتیں۔'' (انشائیہ :سڑک، حامد برگی)

> ''ہر شخص میری طرف متوجہ ہو جاتا ہے ۔ کئی ایک بڑھ کر میرا استقبال کرتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ میں اپنی موجودگی سے ان کے میز کی رونق بڑھاؤں کیونکہ میں ملک کا نامور شاعر ہی نہیں بہت بڑا افسر بھی ہوں، ورنہ خالی خولی شاعروں کو کون پوچھتا ہے۔''(انشائیہ: نکٹائی، ڈاکٹر بشیر سیفی)

> ''سقراط نے زہر پی کر۔ حسینؑ نے شہید ہو کر اور منصورؒ نے سولی قبول کر کے خاموشی سے صبر کے جو عظیم نمونے دکھائے تھے بظاہر وہ اس عہد کے جھوٹوں اور جابروں کے سامنے شکست ہی تھی لیکن

درحقیقت ان مظلوموں اور سچوں کی خاموشی ان کی فتح کی پیش خبری تھی جسے آنے والے وقت نے سچ ثابت کیا۔ مظلوموں کی خاموشی کی یہ سچائی ہمیشہ سے قائم ہے۔" (انشائیہ : خاموشی، حیدر قریشی)

"بسا اوقات تو مجھے ایسی شادیوں میں شامل ہونے کے لیے معاشرتی حربے استعمال کرتے ہوئے بڑی بڑی شخصیات کی سفارشوں کا سہارا بھی لینا پڑتا ہے۔ دراصل میں ہمہ وقت اس قسم کی شادیوں کی تاک میں رہتا ہوں کیونکہ ان میں شریک ہونے سے مجھے زندگی کی سب سے بڑی خواہش کی تکمیل ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔" (انشائیہ : دوسری شادی، جان کاشمیری)

"افسوس کہ مغلوں نے برصغیر میں کرکٹ رائج کرنے کے بجائے اپنا ٹھاٹھ ہی سمیٹ لیا اور برصغیر کا طویل و عریض میدان انگریزوں کے لیے خالی کر دیا تا کہ وہ ایل بی ڈبلیو ہو جانے کے خطرے کو خاطر میں لائے بغیر بے تحاشا اور بے محابا کرکٹ کھیلیں۔ گیند کو معمولی سا بلہ دکھائیں اور جس سمت میں چاہیں پھینک دیں اور پھر خود ہی باؤنڈری کی لکیر پار کرنے کا اعلان کر دیں۔" (انشائیہ : کرکٹ، انور سدید)

ان اقتباسات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انشائیہ کسی آئیوری ٹاور میں بیٹھ کر نہیں لکھا جا رہا ہے بلکہ اسی معاشرتی، سماجی اور سیاسی پس منظر میں لکھا جا رہا ہے جس میں دوسری اصناف لکھی جا رہی ہیں۔ آج کے انشائیوں میں سیاسی، سماجی، اقتصادی اور طبقاتی نظام کے افراط و تفریط کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ تاہم یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انشائیہ نگار کے اظہار کا انداز دوسرے مضمون نگاروں، افسانہ نگاروں سے مختلف ہوتا ہے، یہ کہنا درست نہیں کہ انشائیہ نگار ہمیشہ دوستانہ زبان میں بات کرتا ہے کیونکہ ایک سچے فنکار کی حیثیت سے وہ کسی بھی سماج دشمن قوت کا دوست نہیں ہوتا اور نہ اس سے دوستانہ لب و لہجہ میں گفتگو کرنا پسند کر سکتا ہے۔ ہاں اس کا لب و لہجہ البتہ زیادہ مہذب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انشائیہ اپنے مزاج کے اعتبار سے آج کے مہذب دور سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

(ماخوذ: ماہنامہ اوراق، خاص نمبر، مارچ اپریل، ۱۹۸۶ء، ص ۸۶:)

OOOO

محمد اسد اللہ

انشائیہ کی شناخت

انشائیہ کیا ہے؟

یہ سوال برصغیر کے ادبی حلقوں میں اتنی بار دہرایا جا چکا ہے اور اس کے جواب میں اس قدر صفحات سیاہ کئے جا چکے ہیں کہ ادب کی کسی دوسری صنف کے متعلق اس کی مثال ملنی محال ہے۔ سوال کا لہجہ اس صنف کے متعلق اجنبیت کا تاثر پیش کرتا ہے۔

جاوید وششٹ نے ملّا وجہی کی تصنیف 'سب رس' سے انشائیہ کے نقوش کی نشاندہی کر کے بتایا کہ ہمارا انشائیہ کلیتاً ہمارا اپنا انشائیہ ہے۔

بیشتر ناقدین کے نزدیک انشائیہ ایک ایسی صنف ہے جسے مغرب سے برآمد کیا گیا ہے۔ یہ مغرب کے باغ سے فراہم کی گئی ایک قلم ہے جسے اردو کے باغ میں لگایا گیا ہے۔ انشائیے کے متعلق اردو میں پائی جانے والی یہ الجھن ان مباحث سے آشکار ہے

جو ہندو پاک کے اخبارات ورسائل میں ابھرے۔اس سلسلے میں ہمارے ہاں موجود متضاد تصورات کا اندازہ فضیل جعفری کے اس اقتباس سے بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے:

’’جس طرح پچّیس برس پہلے تک ادبی گالی گلوچ کے لیے رجعت پسند اور زوال آمادہ جیسے کلیشیز بنا لیے گئے تھے ویسے ہی ان دنوں انشائیہ کی اصطلاح استعمال کی جا رہی ہے یعنی جس سے ناراض ہوئے اسے رجعت پسندانہ کہہ کر انشائیہ نگار کہہ دیا۔حساب بیباق ہو گیا چنانچہ ترقّی پسند ٹیم کے نئے گول کیپر مشکور حسین یاد، عسکری کے مضامین کو اگر انشائیہ کہتے ہیں تو ادھر ممتاز نقّاد شمس الرحمن فاروقی فراؔق صاحب کے مضامین کو انشائیہ کہنا پسند کرتے ہیں۔اسی طرح ایک طرف سرکش ادیب باقر مہدی کرشن چندر کے افسانوں کو انشائیہ سے تشبیہ دیتے ہیں تو لسانی تنقید کے سرگرم وکیل ڈاکٹر مغنی تبسم وارث علوی کے مضامین کو انشائیہ گردانتے ہیں۔‘‘(۱)

یہی سبب ہے کہ مشکور حسین یاد انشائیہ کو اس ہاتھی سے تشبیہ دیتے ہیں جس کے متعلق چار اندھے مختلف قیاس آرائیوں میں مبتلا تھے، وہ کہتے ہیں:

’’ہم نے انشائیہ کے ساتھ اس طرح کا سلوک کیا جیسا کہ کچھ اندھوں نے ہاتھی کے ساتھ کیا تھا یعنی جس کے ہاتھ میں ہاتھی کے جسم کا جو حصّہ آ گیا اس نے اسی کو ہاتھی سمجھ لیا...اس میں کوئی شک نہیں کہ ہاتھی کی دم بھی ہاتھی ہی کے جسم کا ایک حصّہ ہے اور ہم ہاتھی کی دم پکڑ کر بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہاتھی ہے، لیکن ایسا اس وقت ممکن ہے جب کہ ہاتھی کی دم کے ساتھ ہماری نگاہیں پورے ہاتھی پر بھی پڑ رہی ہوں یا کم از کم ہم نے ایک بار پورے ہاتھی کا نظارہ کر لیا ہو۔‘‘(۲)

انشائیہ کی بعض جزوی خصوصیات کی بنا پر کم وبیش ہر قسم کی تحریر کو انشائیہ ثابت کیا جاسکتا ہے۔انشائیہ کی شناخت میں یہ چیز اس قدر اہم ہے کہ اردو میں انشائیہ کے متعلق پائے جانے والے اختلاف کی بنیاد بھی یہی ہے۔ایک طبقہ اسے ایک کل کی حیثیت سے تسلیم کرتا ہے جس میں مخصوص محاسن متوقع ہیں۔اس کے حدودِ اربعہ اور ہیئت بھی متعین ہیں۔اس کے برعکس دوسرا طبقہ انشائیہ کو ان قیود سے آزاد خیال کرتا ہے اس نقطہ نظر کی ترجمانی احمد ندیم قاسمی نے ان الفاظ میں کی ہے:

’’میرے نزدیک انشائیہ کسی خاص موضوع کے بارے میں ادیب کی سوچ کا عکس ہوتا ہے۔اس صنف کی متعین صورت نہیں ہے۔ہر ادیب کا سلسلہ خیال دوسرے سے مختلف ہوسکتا ہے۔اس میں حکمت کی گہرائی اور زندگی کی شگفتگی، مسائلِ حیات کی متانت اور ساتھ ہی ہلکی پھلکی ہنسی، سبھی کچھ سما سکتا ہے۔اسی لیے میں انشائیہ پر کسی ہیئت کی چھاپ لگانے کا مخالف ہوں۔‘‘(۳)

انشائیہ کے متعلق مختلف تصورات کی موجودگی کے سبب اس کی شناخت کے سلسلے میں حتمی قسم کی کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی کیونکہ اس کا کوئی واضح تصور سامنے نہیں آتا۔ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

’’جہاں تک انشائیہ پر تنقیدی تحریروں کا تعلق ہے تو ان میں بیشتر کی بنیادی خرابی یہ ہے کہ ان میں اخذ نتائج کے ذہن میں inductive method سے کام نہیں لیا جاتا یعنی انشائیوں کے مطالعہ کے بعد ان کی مشترک خصوصیات یا مابہ الامتیاز خصائص کے استنباط کی بنیاد پر بات کرنے کے برعکس پہلے سے طے شدہ نتائج، مفروضوں یا پھر پالتو تعصّبات کی روشنی میں اچھے یا برے انشائیہ کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔‘‘(۴)

انشائیوں کے اعلیٰ نمونے پیشِ نظر رکھ کر انشائیوں کی تعریف بھی پیش کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں مغربی نقّادوں کی آراء معتبر اور حقیقی محسوس ہوتی ہیں کہ ان کے ہاں انشائیہ کے معیاری تخلیقی نمونے وافر تعداد میں موجود ہیں اور اس صنف کا چار صدیوں پر محیط ارتقاء اس کے واضح خد و خال سمیت انشائیہ کے بنیادی محاسن کو پیش کرنے میں مددگار ثابت ہوا ہے۔ ہمارے ہاں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ معیاری انشائیوں کا فقدان ہے۔ دوّم انشائیے کی ہماری بیشتر تعریفیں ذہنی قیود اور تعصّبات سے مبرا نہیں ہیں۔ اسی طرح ان میں سے اکثر تعریفیں مغربی ناقدین کے خیالات کی بازگشت ہیں۔ علاوہ ازیں مغرب میں بھی اس صنف سے متعلق اختلافِ رائے موجود ہے، بلکہ inductive method کو اپنایا جائے تب بھی مسئلہ اتنا آسان نہیں۔ انگریزی ایسّے میں مختلف اسالیب، رجحانات اور طریقہ کار کی بنیاد پر انشائیہ کی قطعی صورت موجود نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ ہڈسن لکھتے ہیں:

> "Its outlines are so uncertain, and it varies so much in matter, purpose and style that systematic treatment of it is impossible. The question may indeed be raised whether the essay is to be considered as an independent and settled form of literary art at all." (5)

انگریزی انشائیہ اور ہمارے انشائیہ کے سلسلے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ انگریزی میں انشائیہ کے ساتھ فکر اور تخیل جیسے عناصر کو خصوصی تعلق ہونے کے علاوہ انشائیہ کی ذات کو مرکزیت حاصل ہے۔ اس کے برعکس انشا پردازی کے ساتھ اردو میں حسنِ عبارت اور بیان کی لطافتیں وابستہ ہیں اور ان ہی کی بدولت ہماری تحریریں انشائیہ کہلاتی ہیں:

> ”انشائیہ کی شناخت کے سلسلے میں بنیادی اختلاف کے باوجود اس کے محاسن اور بنیادی خصوصیات کا تذکرہ کثرت سے ہوتا رہا ہے۔ اسی سلسلے میں کسی مخصوص نقطہ پر اجماع نہیں ہو پایا اور نہ ہی ممکن ہے۔ اسی ضمن میں سجاد باقر رضوی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مغربی فنِ انشائیہ نگاری کے اصولوں کی روشنی میں انشائیہ کا مطالعہ کیا جائے۔
>
> صنف انشائیہ essay اردو کی اور کئی اصناف کی طرح مغرب سے مستعار ہے۔ لہٰذا اسلوبِ انشائیہ کے سلسلے میں بنیادی طور پر وہی موقف ہونا چاہئے جو مغرب میں برتا گیا ہے۔ مغرب میں یہ صنف اپنے پیچھے کوئی بڑی روایت نہیں رکھتی اس کی ابتدا ہی ایسے عہد میں ہوئی جس میں روایت ترمیم و تنسیخ کے عمل سے گزر رہی تھی۔ ایک شخص کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ زندگی اور اس سے متعلق اقدار و اشیاء کو اپنے زاویے سے اور اپنے تجربات کی روشنی میں دیکھے تو اس نے یہ صنف اختیار کی۔ اسے ایک خاص صنف کا درجہ یوں ملا کہ اس میں وحدت کا وہ بنیادی اصول موجود تھا جو زمانہ قدیم سے ہر فن پارے کی بنیادی خصوصیت سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس کے آگے یہ ہوا کہ لوگوں نے اس روایت کو آگے بڑھایا اور یوں انشائیہ ایک مستقل صنف قرار پائی۔“ (۶)

انشائیہ کی مختلف اساسی خصوصیات دراصل اس کے اجزاء ہیں جن کی بنیاد پر کسی فن پارے کی انشائی کیفیت کو دریافت کیا جا سکتا ہے، البتہ انشائیہ بحیثیت کل جن اہم عناصر پر مشتمل ہوتا ہے ان میں انشائیہ نگار کی ذات اور اس کا منفرد نقطہ نظر خصوصی اہمیت کا

حامل ہے۔ مغربی انشائیوں میں دیگر محاسن کم وبیش موجود ہیں۔ البتہ ان چیزوں کو وہاں بھی انشائیہ کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ ان عناصر کے سائے انشائیہ کے دیگر اجزاء پر پڑتے ہیں۔ مثلاً انشائیہ کی زبان، اسلوب، اندازِ فکر، ہیئت اور اس کا فن۔ یہ تمام مل کر انشائیہ کو ایک کل کی شکل عطا کرتے ہیں۔ انشائیہ کے یہ عناصر کیا رول ادا کرتے ہیں یہ جاننے کے لیے ہم ہر ایک کا الگ الگ جائزہ لیں گے:

انشائیہ اور مضمون میں فرق:

انشائیہ اور مضمون کو ہمارے ہاں تقریباً ایک ہی چیز خیال کیا جاتا ہے۔ انشائیہ مضمون ہی کی ایک قسم ہونے کے باوجود اپنے مخصوص طریقہ کار اور تخلیقی خصوصیت کے سبب مضمون کی مختلف اقسام میں امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ عہدِ سرسید میں لکھے جانے والے بیشتر مضامین عموماً ایسّے کے خطوط پر لکھے گئے اور انھیں مضمون کا نام دیا گیا۔ مثلاً مضامینِ سرسید، مضامینِ رام چندر، مضامینِ ذکاءاللہ وغیرہ۔

ان مضامین کے علاوہ خالص علمی اور تحقیقی مضامین بھی اسی نام سے پیش کیے جاتے رہے۔ اس نوع کی تحریروں میں جو طریقہ استدلال اور قطعیت پائی جاتی ہے۔ اس سے انشائیہ مختلف قسم کی تحریر واقع ہوا ہے۔ اسی فرق کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> ”انشائیہ کو بالعموم مضمون سے خلط ملط کرتے ہوئے، مزاحیہ طنزیہ یا پھر تاثراتی مضمون قسم کی شے سمجھ لیا جاتا ہے جو کہ قطعی غلط ہے مضمون ایک عمومی اصطلاح ہے نہ ہی اپنی انفرادی حیثیت سے مضمون کوئی جداگانہ صنف ہے مضمون کی کئی اقسام ہیں۔ مگر مضمون بذاتِ خود قسم نہیں ہے۔ اس لیے مزاحیہ یا طنزیہ مضمون کی منصوبہ بندی اور ادبی مقاصد قطعی طور سے انشائیہ کے مقابلے جداگانہ نوعیت رکھتے ہیں۔“ (۷)

ڈاکٹر سلیم اختر کی رائے کے برعکس وزیر آغا انشائیہ کو مضمون کی جداگانہ نوعیت تسلیم کرنے کے بجائے ایک مختلف صنف قرار دیتے ہیں۔ اپنے موقف کو واضح کرنے کی غرض سے انھوں نے ادب کی مختلف اصناف کا ایک شجرہ ترتیب دیا ہے:

شجرہ

ادب

نثر ---------------------- شاعری

نثر

داستان ناول، افسانہ، ڈراما، سوانح عمری، سفرنامہ، انشائیہ، مضمون

مضمون

طنزیہ مضمون، مزاحیہ مضمون، تنقیدی مضمون، علمی مضمون، تحقیقی مضمون۔ (۸)

بیشتر ناقدین کے نزدیک انشائیہ مضمون ہی کا ایک پیرایہ ہے جس طرح انگریزی میں لائٹ ایسّے اور پرسنل ایسّے کہہ کر مضمون نگاری کے ایک مخصوص رجحان کو علاحدہ طور پر متعارف کرایا گیا ہے۔ اسی کو اردو میں انشائیہ کے نام سے پیش کیا گیا۔ اس سلسلے میں دیگر مضامین سے اس قسم کی شخصی تحریروں کو الگ کرنے کے لیے جو چیز بنیاد بنائی گئی وہ اس کا غیر رسمی طریقہ کار اور ذاتی عنصر تھا۔ اس سلسلے میں انگریزی ایسے کے متعلق وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی لکھتے ہیں:

> ”ایسیز کو دو قسموں میں تقسیم کر دیا گیا۔ پہلی قسم میں تمام سیاسی، سماجی، مذہبی، ادبی، سوانحی وغیرہ ایسیز کو شامل کیا گیا ہے اور انھیں Formal فارمل یعنی تکلفی اور رسمی کا نام دیا ہے۔ اور دوسری قسم کے ایسیز کو فیمیلیئر Familiar یعنی ذاتی اور شخصی کہا ہے۔ پہلی قسم کے ایسیز کی مثال ایسی ہے جیسے ایک موضوع پر طول طویل مقالہ

> بھی لکھا جا سکتا ہے اور اس موضوع پر پندرہ منٹ میں ختم ہونے والی ریڈیائی تقریر بھی ہو سکتی ہے جو مربوط تو ہوتی ہے مگر مختصر اور نامکمل سی رہتی ہے۔"(۹)

ان منضبط اور مربوط مقالات اور انشائیہ میں امتیازی طور پر یہ فرق پایا جاتا ہے کہ انشائیہ موضوع کو شخصی یا ذاتی حوالے سے پیش کرتا ہے موضوع کے کسی زاویے کو روشن کر کے ایک نئی راہ سجھا کر تصویر مکمل کرنے کا کام قاری کو سونپ دیتا ہے۔ یہ عدم تکمیلیت اس کا حسن ہے جب کہ مضمون میں عدم تکمیلیت کو ایک سقم شمار کیا جائے گا۔

مضمون یا مقالہ کی بندش مصنف کو یہ اجازت نہیں دیتی کہ وہ نفسِ موضوع سے بہت دیر کے لیے دوری اختیار کرے۔ مضمون میں نفسِ مضمون کے ساتھ انصاف شرط ہے۔ اس کے علمی تخلیقی پہلوؤں کو منضبط طور پر پیش کرنا اس کے آداب میں شامل ہے جبکہ انشائیہ میں بے ترتیبی اپنا ایک الگ حسن ایجاد کرتی ہے۔ انشائیہ نگار اپنے موضوع سے الگ ہٹ کر دیگر موضوعات کے ذریعے انشائیہ کے عنوان پر کسی ایک زاویئے سے نئی روشنی ڈال سکتا ہے یا اپنے متعلق تاثرات واحساسات رقم کر کے انشائیہ کے موضوع کو ایک نئی شکل عطا کر سکتا ہے۔ اسی طرح اختصار اور اشارے کنائے میں اپنی بات کو مبہم انداز میں پیش کر سکتا ہے، جس طرح شاعری میں ہوا کرتا ہے۔ اس کے برعکس مضمون یا مقالات وضاحت قطعیت اور تفصیلات سے سروکار رکھتے ہیں۔ اس بنیاد پر انشائیہ مضمون سے قطعی مختلف قسم کی چیز ہے۔

منصوبہ بندی کسی نہ کسی سطح پر دیگر تخلیقی اصناف میں بھی مشاہدہ کی جا سکتی ہے لیکن انشائیہ اس قسم کی منصوبہ بندی سے مبرا ہوتا ہے کیونکہ اس میں سوچ کا آزادانہ بہاؤ پایا جاتا ہے۔ پلاٹ سازی جسے ہم ایک قسم کی منصوبہ بندی ہی کہہ سکتے ہیں، بقول ارسطو ڈرامے کی جان ہے۔ اس کے برعکس انشائیہ نگار جب انشائیہ لکھنے بیٹھتا ہے تو اس کے آگے انشائیہ کا خاکہ واضح طور پر موجود نہیں ہوتا۔ مضمون نگار یا مقالہ نگار کو اپنا تھیسس اور نتائجِ فکر طے کر لینے پڑتے ہیں۔ غرض منصوبہ بندی ایک اہم نکتہ ہے جو انشائیہ کو مضمون یا مقالہ سے جدا کرتا ہے۔

اسی طرح انشائیہ اور مقالہ کا حاصل بھی مختلف ہے اس فرق کی وضاحت ڈاکٹر سید محمد حسنین نے ان الفاظ میں کی ہے:

> "مقالہ پڑھنے کے بعد ہم کچھ سیکھتے یا پاتے ہیں۔ ایسی بات یا ایسا خیال جس سے ہماری علمیت میں گونا گوں اضافہ ہوتا ہے جس سے ہماری شخصیت میں علم کی تابندگی آتی ہے۔ انشائیہ پڑھنے کے بعد ہم کوئی گم کردہ شے پا لیتے ہیں۔ ایسی شے جو روزانہ کی سادہ اور سپاٹ زندگی میں آنکھوں سے روپوش رہتی ہے، ایسی شے جو ٹھوس اور ناقابلِ انکار حقیقتوں میں اوجھل رہتی ہے۔"(۱۰)

ان تمام امور کے علاوہ انشائیہ اپنی تخلیقی حیثیت کے سبب مقالات اور مضامین سے قطعی مختلف ہے، جو اسلوب زبان اور فکر کی سطح پر غیر تخلیقی طریقہ کار اپناتے ہیں اسی طرح انشائیہ اپنی فنّی نزاکتوں کے سبب بعض تخلیقی فن پاروں سے بھی مختلف ہے مثلاً طنزیہ اور مزاحیہ مضمون جن کا فن زندگی کے مختلف مظاہر کو پیش کرنے کے لیے مخصوص طریقہ اپناتا ہے۔ انشائیہ طریقہ کار، مقصد اور اپنی دلچسپیوں کے اعتبار سے مضامین کی ان اقسام سے بھی مختلف قسم کا نثر پارہ قرار پاتا ہے۔

طنزیہ ومزاحیہ مضمون اور انشائیہ:

اردو میں طنزیہ وظریفانہ مضامین کو انشائیہ قرار دینے کا رواج عام ہے۔ اس میں اخباروں کے کالم، ہلکے پھلکے شگفتہ مضامین، خاکے وغیرہ سبھی پر انشائیہ کا لیبل لگا دیا جاتا ہے۔ ان تحریروں کے مطالعے سے یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی ادیب اپنے مضمون میں بھرپور طنز ومزاح کو بروئے کار نہ لا سکے یعنی وار اوچھا پڑ جائے تو اسے بھی

انشائیہ سمجھ لیا جاتا ہے گویا ایک ناکام قسم کا مضمون انشائیہ ہو گیا! بقول ڈاکٹر سید محمد حسنین انشائیہ نگاری کو مزاح نگاری قرار دینا بڑی مضحکہ خیز سی بات ہے۔

طنز و مزاح، ہجو، المیہ، رومان یہ تحریر کی خوبیاں ہیں، تحریر کی صورتیں نہیں ان صفات کو صنف کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟ اور حقیقت یہ ہے کہ انشائیہ ایک صنفِ ادب ہے نہ کہ کسی صنف کا اندازِ تحریر۔ اس سلسلے میں انشائیہ کی امتیازی حیثیت کو انیس ناگی اس طرح بیان کرتے ہیں۔

> ''مقالہ یا مضمون سیال قسم کی ادبی ہیئت ہے جو تصور یا جذبہ کے ساتھ مختلف رنگ اختیار کرتی ہے اس لیے اس کی کوئی معین ہیئت نہیں ہے یہ موم کی ناک ہے۔ اگر ہنسی مذاق پھبتی اور جگت سے انشائیہ جنم لیتا ہے تو پھر نقال بہت بڑے انشا پرداز ہیں اور تہواروں پر جواب الجواب اور تمسخر انشائیوں کے مجموعے ہیں۔'' (۱۱)

اردو میں طنز و ظرافت کی تخلیق دیگر اصناف کی بہ نسبت بیشتر مضمون ہی کے فارم میں ہوئی ہے۔ انشائیہ کے فنی آداب و رموز سے بے خبری کے سبب ان تمام تحریروں کو انشائیہ کے زمرے میں شامل کرنے کا رجحان عام رہا ہے۔ طنز و مزاح کی شوخی اور انشائیہ کی شگفتگی کی علاحدہ پہچان نہ ہوسکی۔ اسی لیے جو طنز و مزاح نگار رہے وہ انشائیہ نگار بھی گردانا گیا جب کہ یہ دونوں اصناف الگ خواص اور طریقہ کار کو اپناتے ہیں۔

انشائیہ طنز و ظریفانہ مضامین سے مختلف قسم کے اظہار کا پیمانہ ہے۔ اس میں طنز و مزاح متوازن مقدار میں ایک معاون قوت کے طور پر بروئے کار لایا جاتا ہے لیکن یہ عناصر اپنی طبعی صلاحیتوں کے ساتھ کسی مضمون میں اپنے فرائضِ منصبی سے عہدہ برآ ہونے لگیں، اس تحریر کا غالب رجحان بن جائیں اور زندگی یا کائنات کے مظاہر سے متعلق کسی انوکھے نقطہ نظر کو پیش کرنے کا وہ مقصد جو انشائیہ کے پیشِ نظر ہوتا ہے فوت ہو جائے تو اس صورت میں وہ تحریر طنز و ظرافت کا اعلیٰ معیار قائم کرنے کے باوجود انشائیہ نہیں کہلا سکتی۔ اسے طنزیہ مزاحیہ مضمون ہی کے زمرے میں شامل کرنا ہوگا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ''طنزیہ مزاحیہ مضامین انشائیہ نگاری کے مختلف اسالیب نہیں بلکہ قطعاً الگ قسم کی تحریریں ہیں اور یہ فرق محض لہجہ اور انداز کا فرق نہیں مزاج کا فرق بھی ہے۔ مثلاً غور کیجئے کہ ایک مزاحیہ مضمون کا طرّہ امتیاز یہ ہے کہ اس میں فاضل جذبہ خارج ہو جاتا ہے جب کہ انشائیہ میں جذبہ صرف ہوتا ہے۔'' (۱۲)

انشائیہ اور طنزیہ و مزاحیہ مضمون میں جذبہ کے صرف ہونے کی نوعیت مختلف ہونے کی وجہ سے ان دونوں سے پیدا ہونے والا تاثر بھی جداگانہ ہوتا ہے۔ انشائیہ چونکہ فطری اظہار اور انشائیہ نگار کے خیالات و تاثرات کا آئینہ ہوتا ہے نیز ایک متوازن اور مہذب شخصیت کا اظہارِ خیال ہے اس لئے اس میں ایک ٹھہراؤ اور لطیف انداز پایا جاتا ہے۔

طنز و مزاح ایک شعوری کاوش کے طور پر تحریر کی مجموعی فضا پیدا کرتا ہے جو اس کے مخصوص ارادوں اور مقاصد کی نمائندگی سے عبارت ہے۔ اس میں طنز اور مزاح الگ الگ رول ادا کرتے ہیں۔ اسٹیفن لی کاک کے بقول:

> ''مزاح زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے جس کا اظہار فنکارانہ طور پر کیا گیا ہو۔''

کلیم الدین احمد طنز و ظرافت کے فرق کو یوں سمجھاتے ہیں:

> ''خالص ظرافت نگار کسی بے ڈھنگی شے کو دیکھ کر ہنستا ہے اور پھر دوسروں کو ہنساتا ہے وہ اس نقص، خامی، بدصورتی کو دور کرنے کا خواہش مند نہیں۔ ہجو گو اس سے ایک قدم آگے بڑھتا ہے اس ناقص و ناتمام منظر سے اس کا جذبہ تکمیل حسن، موزونیت، انصاف

جوش میں آتا ہے اور اس جذبہ سے مجبور ہو کر اس مخصوص مذموم منظر کو اپنی ظرافت اور طنز کا نشانہ بناتا ہے۔ نظری اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ خالص ظرافت اور ہجو کی راہیں الگ الگ ہیں اور منزلیں جدا جدا ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں کو جدا کرنا عموماً دشوار ہے۔"
(۱۳)

طنز اور ظرافت یا ہجو کو الگ کرنا دشوار سہی لیکن ناممکن نہیں۔ اسے کسی بھی فن پارے میں یا عملی زندگی میں علاحدہ کرنے میں جو دشواری پیش آتی ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ طنز یا ہجو کے ذریعے کسی برائی یا ناپسندیدہ عمل کا احساس دلایا جاتا ہے اور اس مقصد کے لیے طنز کرنے والا مبالغہ آرائی کا سہارا لیتا ہے اسی لیے چسٹرٹن کے مطابق:

"ایک سؤر کو اس سے بھی زیادہ مکروہ شکل میں پیش کرنا جیسا کہ خود خدا نے اسے بنایا ہے طنز یا تضحیک سٹائر satire ہے۔"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ طنز کا اصل مقصد ناپسندیدہ افعال یا مظاہر کی روک تھام ہے۔ اور مزاح جو اسٹےفن لی کاک کے مطابق زندگی کی ناہمواریوں کے شعور کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے اس کا مقصد بھی ناہمواریوں پر قہقہوں کے ذریعے ایک نرم قسم کی تنقید ہی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا کا خیال ہے:

"ہنسی ایک ایسی لاٹھی ہے جس کی مدد سے سوسائٹی کا گلہ بان محض شعوری طور پر ان تمام افراد کو ہانک کر اپنے گلّے میں دوبارہ شامل کرنے کی سعی کرتا دکھائی دیتا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے سوسائٹی کے گلّے سے علاحدہ ہو کر بھٹک رہے تھے۔ یعنی ہنسی ایک ایسا آلہ ہے جس کے ذریعے سوسائٹی ہر اس فرد سے انتقام لیتی ہے جو اس کے ضابطہ حیات سے بچ نکلنے کی سعی کرتا ہے۔" (۱۴)

مقصد کے اعتبار سے طنز اور مزاح میں ناہمواریوں اور عدم توازن پر اظہارِ ناپسندیدگی ایک قدرِ مشترک ہے اس اعتبار سے یہ بات انشائیہ کے سلسلے میں ایک نیا زاویہ نظر مہیا کرتی ہے کہ انشائیہ ایک غیر مقصدی صنفِ ادب ہے۔ طنز و مزاح کے ذریعے جن جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے انشائیہ میں یہ عناصر ان مقاصد کے ساتھ رچ بس نہیں سکتے۔ دوم یہ کہ برہمی یا بہجت کے جذبات طنزیہ مزاحیہ تحریر میں طنز و ظرافت کی شکل میں ایک ردِ عمل کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ جب کہ انشائیہ میں ان جذبات کی فقط عکاسی ہوتی ہے شاید ڈاکٹر وزیر آغا کے قول کے مطابق فاضل جذبے کے خارج ہونے اور صَرف ہونے کے مابین بھی یہی فرق ہے۔ اسی مختلف ردِّ عمل اور طریقہ کار کو سمجھانے کی غرض سے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

"طنز میں ادیب ایک مصلح کا روپ اختیار کر لیتا ہے اور بقول ڈاکٹر وزیر آغا وہ فراز پر کھڑا ہو کر نشیب کی ہر چیز پر ایک استہزائی نظر ڈالتا ہے مزاح میں ادیب استہزا اور ہیئت کذائی کا خود نشانہ بنتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ نشیب میں گر کر ناظر کے جذبہ ترحم کو بیدار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ پہلے ناظر کے لبوں پر قہقہہ بیدار ہوتا ہے پھر دل کی کسی اندرونی گہرائی میں رحم کا جذبہ، انشائیہ میں ادیب ایک ہموار سطح پر ناظر کے دوش بہ دوش کھڑا ہو کر منظر سے تحصیلِ مسرت کرتا ہے اور اپنا ردِ عمل بھی رواں دواں انداز میں بیان کرتا جاتا ہے۔" (۱۵)

ان تمام شواہد کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انشائیہ طنزیہ مزاحیہ مضامین سے قدرے مختلف چیز ہے۔ یہ عناصر انشائیہ میں جگہ تو پا سکتے ہیں لیکن ان کی حیثیت معاون قوت ہی کی طرح ہے نیز انشائیہ میں ان کا مقام بھی وہی ہے جو ان دیگر اجزا کا ہے جن کی شمولیت انشائیہ میں ممکن ہے مثلاً ڈرامائیت، افسانوی انداز، شاعرانہ احساس، فلسفیانہ تفکر وغیرہ، لیکن ان تمام یا کسی ایک عنصر کی موجودگی میں بھی انشائیہ انشائیہ

ہی رہے گا نہ کہ ڈرامہ، افسانہ یا شاعری کہلائے گا۔ اسی طرح ان ہی اصناف میں اگر انشائیہ کی کوئی خصوصیت در آئے تو محض اسی بنیاد پر اسے انشائیہ کے زمرے میں داخل نہیں کیا جائے گا۔

ہمارے ہاں پائے جانے والے اس تصور کے باوجود کہ مزاح یا طنز اور انشائیہ ایک ہی چیز ہے، انشائیہ کی فنی اور فکری تنظیم و تشکیل، شگفتگی اور شوخی کی متحمل تو ہو سکتی ہے مگر اس کا وجود لازمی نہیں ہے۔ انشائیہ طنزیہ و مزاحیہ مضامین سے قطعی مختلف قسم کے مزاج، طریقہ کار اور تاثر کو جنم دیتا ہے۔ اسی لیے ان دونوں کے درمیان واضح حدِ فاصل موجود ہے۔

انشائیہ کا فن:

انشائیہ زندگی اور کائنات کی تفہیم نو سے عبارت ہے۔ اس میں پایا جانے والا موضوعات کا تنوع اور آزادانہ تفکر زندگی کی رنگارنگی اور وسعتوں کو سمیٹنے کی ایک سعی ہے۔ جمود، بے حسی اور فرسودگی سے جو موت کی علامت ہے انشائیہ برأت کا اظہار کرتا ہے۔ ہر شام دنیا کے مزید ایک دن پرانا ہو جانے کی خبر دیتی ہے، وہیں ہر صبح اس کے نشاۃِ ثانیہ کا اعلان بن کر نمودار ہوتی ہے۔ انشائیہ نئے لمحات میں ڈھلتی ہوئی زندگی کا آئینہ ہے، ہر لمحہ بدلتی ہوئی اس دنیا میں ہماری نظر انقلابات کی سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی دنیا کا تعاقب کرنے اور پلکوں پر گرتی ہوئی برف ہٹانے سے قاصر ہے۔ ہم ان چیزوں کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ یہ انقلابات ہمارے لیے اب حیرت افزا ہیں نہ مسرت بخش، حتیٰ کہ ان کا احساس بھی ہمیں چھو نہیں پاتا۔ انشائیہ نگار ان تمام مردہ آوازوں کو زندگی عطا کرتا ہے۔ ہمارے احساس کے خرابے میں دھندلائے ہوئے عکس انشائیہ اور کائنات کی کی تخلیق نو کے ذریعے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ نازک کام زبردست قسم کی ہنر مندی کے بغیر ممکن نہیں اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انشائیہ نگاری ایک مشکل فن ہے۔

انشائیہ نگاری اپنے متنوع موضوعات، اسالیب اور گونا گوں دلچسپیوں کے باوصف ادب کی مختلف اصناف کے رنگوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اسی لیے ادبی اظہار کے مختلف پیرایے انشائیہ کی جھلکیاں پیش کرتے ہیں۔ یہ صنف انشائیہ نگار سے بھی شخصیت کی رنگارنگی اور زبردست قسم کی ہنر مندی طلب کرتی ہے۔ انشائیہ میں ان خوبیوں کے علاوہ سب سے اہم چیز اس کا تخلیقی فن پارہ ہونا ہے، بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

> ''لفظ انشاء طرزِ تحریر کی تخلیقی سطح کی نشان دہی کرتا ہے، لازم ہے کہ اس کا اسلوب بھی تخلیقی سطح کے محاسن کا آئینہ دار ہو۔'' (۱۶)

انشائیہ میں انشائیہ نگار کا اسلوب اور فکر بھی اس لیے اہمیت رکھتے ہیں کہ انشائیہ متنوع عناصر کے حسنِ توازن کے نتیجے میں خلق ہوتا ہے۔ بعض اوقات کسی ایک عنصر کی خامی انشائیہ کو اس معیار سے نیچے گرا دیتی ہے۔ آزادانہ تفکر اور زندگی کے متعلق کسی انوکھے پہلو کا اظہار مجموعی طور پر انشائیہ کی امتیازی خصوصیت قرار دی گئی ہے۔ بقول رابر ٹلنڈ :

> ''انشائیہ انسانی فطرت کے کسی نیم تاریک گوشے کو منوّر کرنے کی ایک سعی ہے۔''

اگر انشائیہ اس مقصد کو پورا نہیں کرتا تو بحیثیت ایک انشائیہ اپنے وجود کا جواز پیش کرنے سے قاصر ہے۔ انشائیہ اپنے موضوع کے ان پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے جو ہماری آنکھوں سے اوجھل تھے جیسے ماچس کی تیلی اپنے اطراف کو منوّر کر دیتی ہے اسی طرح انشائیہ بھی موضوع کو نئی روشنی کے ساتھ پیش کر کے مسرت بہم پہنچاتا ہے۔ یہی مسرت اور لطف اندوزی انشائیہ کا حاصل ہے اس کے برعکس طنزیہ و مزاحیہ تحریروں سے حاصل ہونے والا مسرت کا احساس جداگانہ ہے۔

انشائیہ میں نئے مفاہیم کی دریافت کے طریقہ کار کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

”انشائیہ دوسرے کنارے کو دیکھنے کی ایک کاوش تو ہے، مراد محض یہ نہیں کہ آپ دریا کا پل عبور کر کے دوسرے کنارے پر پہنچیں اور اس سے لطف اندوز ہوں۔ اپنی جگہ یہ بات بھی غلط نہیں مگر اصل بات یہ ہے کہ جب آپ دوسرے کنارے پر پہنچتے ہیں تو آپ کا ہر روز کا دیکھا بھالا پہلا کنارہ دوسرا کنارہ بن کر آپ کے سامنے ابھر آتا ہے۔ اب آپ اسے حیرت اور مسرت کے ساتھ دیکھنے لگتے ہیں جیسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔ انشائیہ نگار بھی کچھ کرتا ہے۔ وہ شے یا مظہر کو سامنے سے دیکھنے کے بجائے عقب سے اس پر ایک نظر ڈالتا ہے اور اس کی معنویت کو گرفت میں لے لیتا ہے جو ہمہ وقت ایک ہی مانوس زاویہ سے مسلسل دیکھنے کے باعث اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔“ (۱۷)

انشائیہ دراصل اندرونی طور پر ایک ایسے نظام کو پیش کرتا ہے جس میں غضب کی لچک اور بے پناہ امکانات ہیں۔ انشائیہ حقائق کے اظہار میں نہ صرف ندرت کا مظاہرہ کرتا ہے بلکہ انگریزی اور اردو کے انشائیوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انشائیہ نگار کا اس معاملہ میں اپنا طریقہ کار ہے۔ مثلاً انشائیہ نگار مضمون نگار کی طرح حقیقت کی مکمل وضاحت ہرگز نہ کرے گا بلکہ نشاندہی اور مزید بہتر انداز اپنا کر آپ کے ذہن کو ایک نئی وادیِ خیال میں چھوڑ دے گا اس کے علاوہ فلسفیانہ تفکر کو بروئے کار لائے گا مگر اس کی سنگلاخی اور خشکی کو منہا کر دے گا۔ منطق کی قطعیت سے گریزاں ہو کر اپنی لطیف منطق ایجاد کرے گا جو فلسفیانہ منطق کے برعکس شگفتگی اور شوخی کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے، اس لحاظ سے انشائیہ میں کیا طریقہ کار اپنایا جاتا ہے۔ اس ضمن میں مشکور حسین یاد لکھتے ہیں:

”انشائیہ صرف منطق پر آ کر رک نہیں جاتا وہ اس سے بھی آگے جانا چاہتا ہے اور جاتا بھی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہم زندگی کی صداقتوں کو محض منطق کے بل بوتے پر حاصل نہیں کر سکتے۔ سچائی کی راہ میں منطق ہمیں ایک خاص منزل پر لا کر خود آگے چلنے سے انکار کر دیتی ہے۔ کسی ایک صداقت کے بہت سے رخ آپ کو ایک انشائیہ میں نظر آ سکتے ہیں۔ شاید اس کا ایک ہزارواں حصہ بھی منطق میں نظر نہیں آ سکتا اور یوں انشائیہ کی منطقی صورت خالی پھیکی منطق کی صورت سے کہیں بڑھ کر صداقت ساماں اور صداقت افروز ہوتی ہے۔“ (۱۸)

دیگر اصناف کی بہ نسبت انشائیہ کی تنظیم اس کے مختلف عناصر میں اس کے اسلوب سے گہری وابستگی رکھتی ہے۔ انشائیہ میں craftsmanship کے علاوہ شخصیت کا اظہار فطری طور پر راہ پاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں انشائیہ منفرد اسلوب میں نمودار ہوتا ہے۔ انشائیہ کے فن کی طرح اسلوب کا معاملہ بھی حد درجہ نازک ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

”انشائیہ کے اسلوب میں جو لچک ملتی ہے اس کی بنا پر دیگر اصناف کے اسلوب سے بھی بقدرِ ظرف استفادہ کیا جا سکتا ہے لیکن سلیقہ اور احتیاط کے ساتھ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذرا سی بے احتیاطی یا فنی چوک کے نتیجے میں انشائیہ کا اسلوب اس رس سے محروم ہو جائے گا جو اس کا جوہر سمجھا جاتا ہے اور جس کے بغیر انشائیہ محض ایک روکھا پھیکا نثر پارہ بن کر رہ جاتا ہے۔“ (۱۹)

انشائیہ میں پائی جانے والی لطافت اور تخیل آفرینی بعض اوقات انشائیہ کو غنائیت کی حدود میں داخل کر دیتی ہے اور انشائیہ کی زبان نثر اور نظم کی سرحد پر وجود میں آتی ہے۔ اس پہلو پر غور کریں تو یہ بات آئینہ ہو جاتی ہے کہ انشائیہ میں پائی جانے والی نثری اور شعری زبان کی خصوصیات دراصل اس کا حسن ہی نہیں اس کی ایک بہت بڑی طاقت

بھی ہے۔

ایک انشائیہ اورغزل کے ایک شعر میں ہمیں گہری مماثلت محسوس ہوتی ہے،اس کی وجہ دونوں میں فنکار کا وہ شخصی اظہار ہے جس کے توسط سے وہ اپنے دل کی بات اور منفرد محسوسات ہم تک پہنچانا چاہتا ہے اور اس کا وہ تپیدہ جذبہ اظہار کی سعی میں غنائیت کی سرحدوں کو چھو کر دیگر اصناف سے ممتاز پیرایہ اختیار کر لیتا ہے۔انشائیہ میں ہمیں اسی منفرد زبان واسلوب کے نقوش ملتے ہیں۔

نثر کی خصوصیت وضاحت اور تفصیل کا پیش کرنا ہے اس کے برعکس شاعری ایجاز واختصار اور رمز و کنایہ کو بروئے کار لا کر اپنا مطلب ادا کرتی ہے۔غرض انشائیہ ان دونوں خصوصیات سے بھر پور استفادہ کر کے حقائق کا فنی اظہار کرتا ہے اسی سے مماثل عنصر،فلسفیانہ تفکر اور منطق بھی ہے۔ان عناصر کو بھی انشائیہ اظہاری قوت کے طور پر اپنے انداز سے استعمال کرتا ہے۔ان تمام باتوں کے پیش نظر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انشائیہ کا فن پر پیچ و نازک ہونے کے علاوہ فطری سادگی اور پرکاری کا مظہر ہے۔باایں ہمہ انشائیہ نگاری اپنے دامن میں لامحدود امکانات سمیٹے ہوئے ہے اور زبردست قسم کی فنکاری اور ہنرمندی سے عبارت ہے۔

حواشی:

۱۔ فضیل جعفری،زخم اور کمان،بمبئی،۱۹۸۵ء،ص ۱۸:

۲۔ مشکور حسین یاد،ممکناتِ انشائیہ،لاہور، ۱۹۸۳ء،ص ۵۳:

۳۔ احمد ندیم قاسمی،انشائیہ اور اہلِ قلم،مشمولہ :انشائیہ کی بنیاد،ڈاکٹر سلیم اختر،لاہور، ۱۹۸۶ء،ص ۳۷۱:

۴۔ ڈاکٹر سلیم اختر،انشائیہ کی بنیاد،لاہور،۱۹۸۶ء،ص ۳۸۴:

۵۔ W. H. Hudson, An Introduction to the study of literature, Page 331, London,1558.

۶۔ سجاد باقر رضوی،انشائیہ اور اہلِ قلم،مشمولہ:انشائیہ کی بنیاد، ڈاکٹر سلیم اختر، لاہور،ص ۳۷۳:

۷۔ انشائیہ کی بنیاد،ڈاکٹر سلیم اختر،لاہور،۱۹۸۶ء،ص ۳۷۳:

۸۔ ڈاکٹر وزیر آغا ،انشائیہ کا سلسلہ نسب ،مشمولہ: تنقید اور مجلسی تنقید ،نئی دہلی، ۱۹۸۲ء،ص ۵۱:

۹۔ ظہیرالدین مدنی ،اردوایسز،ص ۲۵:

۱۰۔ صنف انشائیہ اورانشائیے،ڈاکٹر سید محمد حسنین،لکھنو، ۱۹۷۳ء،ص ۱۵:

۱۱۔ انیس ناگی،بحوالہ:انشائیہ کی بنیاد،ڈاکٹر سلیم اختر،۱۹۸۶ء،ص ۳۶۵:

۱۲۔ ڈاکٹر وزیر آغا،انشائیہ کا سلسلہ نسب،مشمولہ: تنقید اور مجلسی تنقید ،نئی دہلی، ۱۹۸۲ء،ص ۵۳:

۱۳۔ کلیم الدین احمد،اردو میں طنز وظرافت،مشمولہ: طنز ومزاح۔تاریخ وتنقید،مرتبہ: طاہر تونسوی،دہلی،۱۹۸۶ء،ص ۲۷:

۱۴۔ ڈاکٹر وزیر آغا،اردو ادب میں طنز ومزاح،نئی دہلی،۱۹۷۸ء،ص ۲۴:

۱۵۔ ڈاکٹر انور سدید،اردو انشائیہ،مشمولہ: ذکر اس پری وش کا،سرگودھا، ۱۹۸۲ء، ص ۳۰:

۱۶۔ انشائیہ کے خدوخال،ڈاکٹر وزیر آغا،ص ۱۴:

۱۷۔ ڈاکٹر وزیر آغا،دوسرا کنارہ،سرگودھا، ۱۹۸۲ء،ص ۱۵:

۱۸۔ مشکور حسین یاد،ممکناتِ انشائیہ،لاہور، ۱۹۸۳ء،ص ۹۵:—۹۹

۱۹۔ ڈاکٹر سلیم اختر،انشائیہ کی بنیاد،لاہور،۱۹۸۶ء،ص ۲۴۵:

OOOO

کتابیات انشائیہ

تعریف:

'اردو انشائیہ' کی اصطلاح انگریزی ایسّے (essay) کے مترادف ہے لیکن انشائیہ وہ ایسّے نہیں جس کے تحت ہر قسم کی مضمون نگاری آجاتی ہے بلکہ یہ ایسّے کی ایک خاص قسم ہے جسے پرسنل ایسّے (personal essay) کہتے ہیں اور جس میں موضوع کا اسیر ہونے کی بجائے موضوع کے حوالے سے آزادہ روی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ انشائیہ کی اس خصوصیت کے باعث جانسن نے اسے ذہن کی آزاد ترنگ کا نام دیا ہے۔عمومی ایسّے یعنی مضمون میں اس آزادہ روی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ انشائیے میں معروضیت کے بجائے موضوعیت پائی جاتی ہے یعنی اس میں داخلی رنگ غالب ہوتا ہے۔انشائیہ کا آغاز بھی غیر رسمی ہوتا ہے اور اختتام بھی، کیونکہ انشائیہ نگاری نتائج تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتا جبکہ عمومی ایسّے میں تمہید بھی ہوتی ہے اور دلائل کا سلسلہ قائم کرکے نتائج بھی اخذ کیے جاتے ہیں۔سب سے اہم بات یہ کہ انشائیہ نگار موضوع کے ایسے گوشے اجاگر کرتا ہے جو عموماً نظروں سے اوجھل رہتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے وہ ذاتی اور انفرادی تجربات و محسوسات کو اولیت دیتا ہے۔انشائیے کی یہ خصوصیت ایسی ہے کہ جو اسے دیگر اقسام کے تخلیقی مضامین سے ممیز و ممتاز کرتی ہے۔بعض لوگ طنزیہ و مزاحیہ مضامین کو بھی انشائیہ سمجھتے ہیں جو درست نہیں۔انشائیہ میں طنزیہ و مزاحیہ عناصر تو ہوسکتے ہیں مگر مزاج کے لحاظ سے انشائیہ کو طنزیہ و مزاحیہ مضامین سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔

پس منظر:

اردو انشائیہ کے منتشر اجزاء تو سر سید احمد خاں کے بعض مضامین مثلاً گزرا ہوا زمانہ، کاہلی، امید کی خوشی، انسان کے خیالات وغیرہ میں بھی مل جاتے ہیں کیونکہ اردو میں مضمون نگاری انگریزی ایسّے کی تقلید ہی میں شروع ہوئی تھی مگر حقیقتاً اردو انشائیہ کا آغاز عبدالحلیم شرر کے بعض مضامین سے ہوتا ہے جو ۱۸۸۷ء سے ۱۸۸۹ء کے دوران 'دلگداز' میں شائع ہوئے اور 'مضامین شرر' کی پہلی جلد میں شامل ہیں۔اس ضمن میں ان کے مضامین کل، انتظار، لالۂ خودرو اور آسمان وغیرہ بالخصوص قابل ذکر ہیں۔میر ناصر علی اگرچہ شرر سے سینئر ہیں مگر ان کے جن مضامین میں انشائیہ کے اوصاف موجود ہیں وہ ۱۹۰۸ء کے بعد 'صلائے عام' میں لکھے گئے اس لیے ادب میں زمانی تقدم کے باوجود انشائیہ کے حوالے سے ان کا ذکر شرر کے بعد ہی مناسب ہے۔ان کا ایک مضمون 'مسکرانا' جدید انشائیے سے لگّا کھاتا ہے۔ہم اور ہماری ہستی، مآل زندگی، یادش بخیر اور بعض دیگر مضامین میں بھی انشائیہ کے اوصاف موجود ہیں۔سجاد حیدر یلدرم کا ایک مضمون 'مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ' بھی انشائیے کے ذیل میں آجاتا ہے۔یہ مضمون اگرچہ ایک انگریزی مضمون سے ماخوذ ہے مگر اس میں اس حد تک تصرف کیا گیا ہے کہ یہ خالصتاً اردو کی چیز بن گیا ہے۔ جوش ملیح آبادی کے دو مضامین : نشہ اور بنی نوع انسان اور ایک رند کا اعلان جنگ بھی انشائیہ کہے جاسکتے ہیں۔سجاد انصاری کے مضامین میں بھی انشائیہ کے بعض اوصاف موجود ہیں۔میاں عبدالعزیز فلک پیا کے مضامین کو بھی انشائیہ سے اک گونہ نسبت ہے ان کے مضامین: میراز ینہ، پچیس اور تیس، الفاظ اور رنگ اور پانی کا بلبلہ انشائیہ کے ذیل میں آسکتے ہیں۔ خلیقی دہلوی کا ایک مضمون : حریص رقص بھی انشائیوں کی فہرست میں شامل کیا جاسکتا ہے۔آغا شاعر قزلباش کا ایک مضمون: کھلتا ہوا پتہ میں بھی انشائی خصوصیات

موجود ہیں۔ حجاب امتیاز علی ، قاضی عبدالغفار، سرذوالفقار علی، مولوی عزیز مرزا اور شیخ محمد اکرم کے ہاں بھی انشائیہ نما تحریروں کا سراغ ملتا ہے۔

طنز و مزاح نگاروں میں سے بھی بعض مصنفین کے ہاں انشائیہ کے نمونے مل جاتے ہیں۔ اس ضمن میں خواجہ حسن نظامی سرفہرست ہیں۔ انھوں نے بعض ایسے موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے جو انشائیہ سے مخصوص سمجھے جاتے ہیں ان کے ایسے مضامین میں انشائیہ کے اوصاف بھی موجود ہیں مثلاً گلاب تمہارا کیکر ہمارا، جھینگر کا جنازہ، مچھر، الو، پیاری ڈکار وغیرہ۔ اپنے ان مضامین کی وجہ سے وہ اردو انشائیہ نگاروں کی صف میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف 'غبار خاطر' کے بعض حصوں میں بھی انشائیہ کا انداز موجود ہے بالخصوص چائے نوشی کے تجربات وغیرہ کا بیان مگر ان کے ہاں انشائیہ علیحدہ صنف کے طور پر موجود نہیں۔ منفرد مزاح نگار رشید احمد صدیقی کے بعض مضامین مثلاً دھوبی، چارپائی، ارہر کا کھیت وغیرہ بھی انشائیہ سے خاصے قریب ہیں۔ شوکت تھانوی کے مضامین میں سے تکلفات اور پنشن انشائیہ کی حدود میں داخل کیے جاسکتے ہیں۔ کنہیالال کپور کے دو مضامین آگ جلانا اور بے قاعدگیاں بھی انشائیہ کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ کرشن چندر کے مجموعۂ مضامین 'ہوائی قلعے' کی نگارشات میں سے بدصورتی، رونا، آنکھیں اور ہوائی قلعے انشائیوں کی فہرست میں شامل ہونے کے لائق ہیں۔ امجد حسین کے مجموعۂ مضامین 'جملۂ معترضہ' کے اکثر مضامین میں انشائیہ کی خوبیاں موجود ہیں۔ چھوٹے بھائی، فراغت برائے فراغت، غسل خانے، عید کے فقیر اور میرے یہ سفید بال میں انشائی رویہ اتنا توانا ہے کہ انھیں انشائیہ کہنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے۔ ایم آر کیانی کی تحریروں میں اگرچہ یہاں وہاں انشائیہ کا انداز جھلکتا ہے مگر مجموعی طور پر ان کی کوئی تحریر انشائیہ کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔ مشتاق احمد یوسفی کے مضامین 'پڑیئے گر بیمار'، چارپائی اور کلچر اور صنف لاغر کو بھی انشائیہ ہی کہنا چاہیے کیونکہ ان میں انشائیہ کا رنگ و آہنگ موجود ہے۔ مرزا محمد منور کے مجموعۂ مضامین 'اولاد آدم' کے دو مضامین باذوق اور باتیں میں انشائیہ کی خصوصیات ملتی ہیں۔ ڈاکٹر داؤد رہبر کی کتاب 'نسخہ ہائے وفا' کا ایک مضمون 'لمحے' بھی انشائیہ کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ ممتاز افسانہ نگار ممتاز مفتی کے مجموعۂ مضامین 'غبارے' کی بعض نگارشات بھی انشائیہ کے دائرے میں آجاتی ہیں۔

پیش منظر :

اوپر جن تحریروں کو انشائیہ کہا گیا وہ انشائیہ کے نام سے پیش نہیں کی گئیں تھیں کیونکہ انشائیہ کی اصطلاح رواں صدی کی پانچویں دہائی کے اواخر میں ڈاکٹر وزیر آغا کی تحریروں سے عام ہوئی جنھوں نے اس صنف کے خدوخال واضح کرنے کے لیے متعدد مضامین سپرد قلم کرنے کے علاوہ وافر تعداد میں معیاری انشائیے بھی تخلیق کیے۔ یہی وجہ ہے کہ انشائیے کے ضمن میں ان کا نام مستقل اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے انشائیے قاری کو اتنے غیر محسوس طریقے سے فلسفیانہ نکات اور جبلت انسانی کے مخفی گوشوں سے روشناس کراتے ہیں کہ قاری ازخود رفتگی کے عالم میں ان کا ہم نوا ہو جاتا ہے۔ ان کے معاصر نظیر صدیقی کی کتاب 'شہرت کی خاطر' کا دیباچہ انشائیہ فہمی میں تو اہمیت رکھتا ہے مگر اس کتاب کی نگارشات میں نکتۂ آفرینی کا وہ میلان نظر نہیں آتا جو انشائیہ نگاری کی بنیادی خوبی ہے۔ وہ ان مضامین میں انشائیہ نگار کے بجائے طنز نگار کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ تاہم وہ انشائیہ لکھنے پر بھی قادر ہیں۔ دوست اور دوستی، پدرم فقیر بود اور شادی یقیناً انشائیے ہیں مگر مجموعی طور پر ان کے مضامین کا مزاج طنز و مزاح ہی سے عبارت ہے۔ مشکور حسین یاد اگرچہ انشائیہ کے نام پر سنجیدہ اور مزاحیہ مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں۔ مگر چونکہ جوہر اندیشہ کی بیشتر تحریروں میں وہ شگفتگی موجود ہے جو بے ساختگی کا دوسرا نام ہے۔ اس لیے انھیں انشائیہ نگاروں کی صف میں شامل کیا جانا چاہیے۔ مشتاق قمر فنی طور پر یقیناً کامیاب انشائیہ نگار ہیں مگر پر تصنع مزاح اور غیر ضروری طوالت نے ان کے انشائیوں کی

قدر و قیمت کو نقصان پہنچایا ہے۔ جمیل آذر نے مجرد فکری موضوعات کے بجائے ایسے موضوعات پر انشائیے تحریر کیے ہیں جو عصری واقعات و مسائل سے بھی متعلق ہیں۔ چنانچہ ان کے ہاں ایک اخلاقی رویہ بھی نظر آتا ہے۔ غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں کی بنیادی صفت بے ساختہ مزاح ہے تاہم مزاح ان کے انشائیوں پر اس طرح حاوی نہیں ہوتا کہ انشائی مزاج ہی دب کر رہ جائے۔ انور سدید کے انشائیوں کا وصف خاص تحریف سے شگفتگی پیدا کرنا ہے۔ سلیم آغا قزلباش عام طور پر معمولی اشیاء کو موضوع بنا کر ان کے غیر معمولی پہلو اجاگر کرنے کی کوشش ہیں۔ اکبر حمیدی کے انشائیوں کا مرکزی نقطہ انسان کی ذات ہے۔ کامل القادری اپنے انشائیوں میں تہذیبی پس منظر کو موضوع بناتے ہیں۔ احمد جمال پاشا اگرچہ مزاح کے واسطے سے انشائیہ نگاری کی طرف مائل ہوئے مگر ان کے انشائیوں اور طنزیہ ومزاحیہ مضامین میں ایک واضح حدفاصل موجود ہے۔ البتہ ارشد میر اپنے انشائیوں میں مزاح سے دامن نہیں چھڑا سکے نیز ان کے انشائیے غیر ضروری طوالت کے حامل ہوتے ہیں۔ محمد اسد اللہ، جان کاشمیری، حامد برگی، اقبال انجم، یونس بٹ، ریاض الرحمان، سلمان بٹ، طارق جامی، تقی حسین خسرو، شمیم ترمذی بھی اب معروف انشائیہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ نئے لکھنے والوں میں محمد اسلام تبسم، حیدر قریشی، رشید گریجہ، انجم نیازی، اظہر ادیب، امجد طفیل، رعنا تقی، سعشہ خان، فرح سعید رضوی اور شعیب خالق کے نام شامل ہیں۔ دیگر اصناف ادب کے جن ممتاز ادبا نے اس صنف کی طرف توجہ کی ان میں شہزاد احمد، غلام الثقلین نقوی، منشایاد، جوگندر پال اور صابر لودھی قابل ذکر ہیں اور روز بروز اس صنف ادب کے لکھنے والوں میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے جو اس صنف کی مقبولیت کی دلیل ہے۔

انشائیوں کے مجموعے:

☆ آم کے آم، رام لعل نابھوی، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، اول ۱۹۸۳ء، (پیش لفظ: از مصنف)

☆ آمنا سامنا، سلیم آغا قزلباش، مکتبہ فکر و خیال لاہور، اول ۱۹۸۷ء

☆ جزیرے کا سفر، اکبر حمیدی، مکتبہ فکر و خیال لاہور، اول ۱۹۸۵ء، (پیش لفظ: ڈاکٹر وزیر آغا)

☆ جوہر اندیشہ، مشکور حسین یاد، مکتبہ اردو ڈائجسٹ لاہور، اول ۱۹۷۵ء، (ابتدائیہ: احمد ندیم قاسمی)

☆ چاہ خنداں، محمد یونس بٹ، مکتبہ داستان لمیٹڈ لاہور، اول ۱۹۸۵ء، (دیباچہ: از مصنف)

☆ چوری سے یاری تک، وزیر آغا، جدید ناشرین لاہور، اول ۱۹۶۶ء، (پیش لفظ: مشتاق احمد یوسفی)، بار دوم موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی، ۱۹۸۲ء

☆ خیال پارے، وزیر آغا، اکامی پنجاب لاہور، اول ۱۹۶۱ء، (تقدیم: مولانا صلاح الدین احمد)، (انشائیہ کیا ہے؟ از مصنف)
بار دوم مکتبہ اردو زبان سرگودھا، ۱۹۸۴ء

☆ دوسرا کنارہ، وزیر آغا، مکتبہ اردو زبان سرگودہا، ۱۹۸۲ء، (پیش لفظ: از مصنف)، بار دوم سیمانت پرکاشن دہلی، ۱۹۸۵ء

☆ ذکر اس پری وش کا، انور سدید، مکتبہ اردو زبان سرگودھا، اول ۱۹۸۲ء، (پیش لفظ: جمیل آذر... پس منظر از مصنف)

☆ سرگوشیاں، سلیم آغا قزلباش، مکتبہ اردو زبان سرگودہا، اول ۱۹۸۰ء، (حرف اول: مشتاق قمر... حرف آخر: ڈاکٹر انور سدید)

☆ سوچ زاویے، رشید احمد گریجہ، قرطاس فیصل آباد، اول ۱۹۸۶ء

☆ شاخ زیتون، جمیل آذر، مکتبہ اردو زبان سرگودہا، اول ۱۹۸۱ء

☆ ہم ہیں مشتاق، مشتاق قمر، مکتبہ اردو زبان سرگودہا، اول ۱۹۷۰ء، (پیش

لفظ: انور سدید)

انشائیوں کے انتخابی مجموعے:

☆ اردو انشائیہ، سید صفی مرتضیٰ، نسیم بک ڈپو لکھنو، اول ۱۹۶۰ء، (پیش لفظ: احتشام حسین... مقدمہ: از مرتب)
☆ اردو ایسّیز، ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ بمبئی، اول ۱۹۵۸ء، (تعارف: نیاز فتح پوری... مقدمہ: از مرتب)
☆ اردو کا بہترین انشائی ادب، ڈاکٹر وحید قریشی، میری لامشریری لاہور، اول ۱۹۶۴ء، (پیش لفظ از مرتب)
☆ اردو کے بہترین انشائیے، جمیل آذر، مکتبہ اردو زبان سرگودہا، اول ۱۹۷۶ء، (پیش لفظ بعنوان اردو انشائیہ کے سو سال از انور سدید)
☆ انشائیہ، ڈاکٹر آدم شیخ، رائیٹرس ایمپوریم لمیٹیڈ بمبئی، اول ۱۹۶۵ء، (مقدمہ از مرتب)
☆ انشائیہ ۱۹۸۱ء، مرتبہ سلمان بٹ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
☆ صنف انشائیہ اور انشائیے، ڈاکٹر سید محمد حسنین، ایوان اردو پٹنہ، چہارم ۱۹۷۸ء
☆ منتخب انشائیے، سلیم آغا قزلباش، مکتبہ اردو زبان سرگودہا، اول ۱۹۸۴ء، (پیش لفظ از مرتب)

تخلیقی مضامین کی کتب جن میں بعض انشائیے یا انشائیہ نما تحریریں موجود ہیں:

☆ ادب زریں، حجاب امتیاز علی، عصمت بکڈ پو دہلی، دوم ۱۹۴۳ء
☆ ادبستان، خلیقی دہلوی مرتبہ اختر شیرانی، کتاب منزل لاہور، سوم سن نداردو۔
☆ اشارات، جوش ملیح آبادی، نگارستاں ایجنسی دلی، اول سن ندارد۔
☆ انتخاب مخزن، حصہ اول، شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور، سن ندارد۔
☆ انشائیہ پچیسی، ڈاکٹر جاوید وششٹ، تقسیم کار سلوجہ پرکاشن نئی دہلی بھارت، اول ۱۹۸۵ء
☆ انشائیے، فضل احمد صدیقی، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی، ۱۹۶۷ء
☆ اولادِ آدم، محمد منور، مکتبہ اردو ڈائجسٹ لاہور، ۱۹۷۳ء
☆ پھوار، شمیم ترمذی، کاروان ادب ملتان، اول ۱۹۸۶ء
☆ ترنگ، علی اکبر قاصد، ایوان اردو پٹنہ، ۱۹۵۶ء
☆ تیسن پیسے کی چھوکری، قاضی عبد الغفار، ادارۂ نو لاہور، سن ندارد۔
☆ جملۂ معترضہ، امجد حسین، اردو بک سٹال لاہور، ۱۹۵۵ء
☆ اک طرفہ تماشا ہے، غلام الثقلین نقوی، مکتبہ فکر و خیال لاہور، اول ۱۹۸۵ء
☆ چراغ تلے، مشتاق احمد یوسفی، مکتبۂ دانیال کراچی، ۱۹۸۱ء
☆ حماقتیں میرے مقدر کی، صلاح الدین حیدر، مکتبہ کاروان ادب ملتان، اول ۱۹۷۸ء
☆ خبطی، شوکت تھانوی، لارک پبلشرز کراچی، ۱۹۶۲ء
☆ خیالات عزیز، مولوی عزیز مرزا، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، اول ۱۹۶۱ء
☆ خیالستان سجاد حیدر یلدرم، فرمان علی اینڈ سنز لاہور، سن ندارد۔
☆ سفید بال، سلمان بٹ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، اول ۱۹۸۶ء، (پیش لفظ: ڈاکٹر سلیم اختر)
☆ سیپارۂ دل، خواجہ حسن نظامی، خواجہ اولاد کتاب گھر نئی دہلی، ہشتم ۱۹۶۴ء
☆ شہرت کی خاطر، نظیر صدیقی، پاک کتاب گھر ڈھاکہ، اول ۱۹۶۱ء
☆ شیشہ و تیشہ، کنہیا لال کپور، مکتبہ جدید لاہور، دوم ۱۹۵۰ء
☆ غبار خاطر، ابو الکلام آزاد، میری لامشریری لاہور، دوم ۱۹۶۲ء

☆ غبارے، ممتاز مفتی، مکتبہ اردو لاہور، اول ۱۹۵۴ء
☆ گرد کارواں، کنہیا لال کپور، میری لائبریری لاہور، پنجم ۱۹۷۰ء
☆ محشر خیال، سجاد انصاری، آئینۂ ادب لاہور، سوم ۱۹۵۷ء
☆ مضامین رشید، رشید احمد صدیقی، مکتبہ اردو ادب لاہور، سن ندارد۔
☆ مضامین سرسید، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، مکتبہ خیابان ادب لاہور، اول ۱۹۶۷ء
☆ مضامین شرر، عبدالحلیم شرر، عبدالرشید اینڈ برادرز تاجر کتب لاہور، اول ۱۹۲۵ء
☆ مقامات ناصری، مرتبہ انصار ناصری، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، اول ۱۹۶۹ء
☆ نسخہ ہائے وفا، ڈاکٹر داؤد رہبر، اکادمی پنجاب لاہور، اول ۱۹۵۸ء
☆ نشاط خاطر، حسنین عظیم آبادی، ایوان اردو پٹنہ، دوم ۱۹۸۰ء (پیش لفظ : کلیم الدین احمد)
☆ ہوائی قلعے، کرشن چندر، اردو بک سٹال لاہور، اول ۱۹۵۶ء

انشائیہ پر مستقل تصانیف:

☆ ممکنات انشائیہ، مشکور حسین یاد، پولیمر پبلی کیشنز لاہور، اول ۱۹۸۳ء
☆ انشائیہ اردو ادب میں، ڈاکٹر انور سدید، مکتبہ فکر و خیال لاہور، ۱۹۸۴ء
☆ انشائیہ کی بنیاد، ڈاکٹر سلیم اختر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۶ء

تنقیدی مضامین کے مجموعے جن میں انشائیہ پر مضامین یا انشائیہ کا ذکر موجود ہے:

☆ اختلافات، ڈاکٹر انور سدید، مکتبہ اردو سرگودہا، اول ۱۹۷۵ء
☆ ادب اور تنقید، ڈاکٹر سید شاہ علی، مکتبہ اسلوب کراچی، اول ۱۹۶۲ء
☆ ادب کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر سلام سندیلوی، میری لائبریری لاہور، چہارم ۱۹۷۱ء
☆ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، ڈاکٹر سلیم اختر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، پنجم ۱۹۷۸ء
☆ اصناف ادب، رفیع الدین ہاشمی، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۷۶ء
☆ بہترین مقالات (۱۹۷۸ء)، مرتبہ سجاد نقوی، مکتبہ اردو زبان سرگودہا، ۱۹۸۰ء
☆ تاثرات و تعصّبات، نظیر صدیقی، شعبہ تخلیق و اشاعت مدرسہ عالیہ ڈھاکہ، اول ۱۹۶۲ء
☆ تحقیق و تنقید، اختر اورینوی، شاد بک ڈپو پٹنہ، سن ندارد۔
☆ تنقید اور احتساب، ڈاکٹر وزیر آغا، جدید ناشرین لاہور، اول ۱۹۶۸ء
☆ تنقید و مجلسی تنقید، ڈاکٹر وزیر آغا، آئینۂ ادب لاہور، دوم ۱۹۸۶ء
☆ دائرے اور لکیریں، ڈاکٹر وزیر آغا، مکتبہ فکر و خیال لاہور، اول ۱۹۸۶ء
☆ سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ، ڈاکٹر سید عبداللہ، مکتبہ کاروان لاہور، ۱۹۶۰ء
☆ فاروقی کے تبصرے، شمس الرحمان فاروقی، مکتبہ شب خون الہ آباد، ۱۹۶۸ء
☆ فکر و خیال، انور سدید، مکتبہ اردو زبان سرگودھا، اول ۱۹۷۱ء
☆ ماسٹر رام چندر اور اردو کے ارتقا میں ان کا حصہ، ڈاکٹر سیدہ جعفر، اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد دکن، اول ۱۹۶۰ء
☆ مضامین نو، خلیل الرحمن اعظمی، ایجوکیشنل بک ڈپو علی گڑھ، ۱۹۷۷ء
☆ مطالعے، سجاد نقوی، مکتبہ فکر و خیال لاہور، ۱۹۸۷ء
☆ نئے تناظر، ڈاکٹر وزیر آغا، آئینۂ ادب لاہور، اول ۱۹۸۱ء
☆ نئے مقالات، ڈاکٹر وزیر آغا، مکتبہ اردو زبان سرگودہا، اول ۱۹۷۲ء
☆ نیاز فتح پوری، ڈاکٹر امیر عارفی، انجمن ترقی اردو دہلی، ۱۹۷۷ء
☆ وزیر آغا: ایک مطالعہ، ڈاکٹر انور سدید، مکتبہ اسلوب کراچی، ۱۹۸۲ء

ادب کے سالانہ جائزے جن میں انشائیہ کا ذکر موجود ہے:

- ☆ ۱۹۸۰ء کا اردو ادب، ڈاکٹر انور سدید،
  اوراق لاہور، فروری مارچ ۱۹۸۱ء۔۔۔ امروز لاہور، جنوری ۱۹۸۱ء
- ☆ ۱۹۸۱ء کا اردو ادب، ڈاکٹر انور سدید
  اوراق لاہور، نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء۔۔۔ جنگ لاہور، جنوری ۱۹۸۲ء
- ☆ ۱۹۸۲ء کا اردو ادب، ڈاکٹر انور سدید، جنگ لاہور، جنوری ۱۹۸۳ء
- ☆ ۱۹۸۳ء کا اردو ادب، ڈاکٹر انور سدید، جنگ لاہور، جنوری ۱۹۸۴ء
- ☆ ۱۹۸۴ء کا اردو ادب، ڈاکٹر انور سدید، جنگ لاہور، جنوری ۱۹۸۵ء
  کتاب نما دہلی، فروری مارچ ۱۹۸۵ء۔۔۔ امروز لاہور، جنوری ۱۹۸۵ء
- ☆ ۱۹۸۵ء کا اردو ادب، ڈاکٹر انور سدید،
  جنگ لاہور، جنوری ۱۹۸۶ء۔۔۔ کتاب نما دہلی، اپریل ۱۹۸۶ء
- ☆ ۱۹۸۶ء کا اردو ادب، ڈاکٹر انور سدید، جنگ لاہور، جنوری ۱۹۸۷ء
- ☆ گزشتہ دس سال کی نمایاں نثری تخلیقات، میرزا ادیب، امروز لاہور، دہ سالہ نمبر ۲۳ مارچ ۱۹۵۸ء

فن انشائیہ پر متفرق مضامین:

- ☆ ادب عصری آگہی اور انشائیہ، ڈاکٹر انور سدید، ماہنامہ شاعر بمبئی، شمارہ نمبر ۷، ۱۹۸۶ء
- ☆ ادب کی ایک خاص صنف، ڈاکٹر سید محمد حسنین، نگار پاکستان کراچی، اصناف ادب نمبر، ۱۹۶۶ء
- ☆ اردو انشائیہ، انور سدید، آہنگ گیا (بھارت)، اگست ۱۹۸۳ء
- ☆ اردو انشائیہ: ایک پھیلتا آفاق، راجہ محمد ریاض الرحمن، اوراق لاہور، مارچ اپریل ۱۹۸۶ء
- ☆ اردو انشائیہ: پس منظر و پیش نظر، ڈاکٹر بشیر سیفی، نیرنگ خیال راولپنڈی، ستمبر ۱۹۸۷ء
- ☆ اردو انشائیہ کا ارتقائی سفر، راغب شکیب، اردو زبان سرگودہا، انشائیہ نمبر، مارچ اپریل ۱۹۸۳ء
- ☆ ۸۶ء کا انشائی ادب، محمد اسلام تبسم، امروز لاہور، ۲ جنوری ۱۹۸۷ء
- ☆ اردو انشائیے کا ایک سال، اکبر حمیدی، اردو ادب راولپنڈی، مارچ اپریل ۱۹۸۳ء
- ☆ اردو انشائیے کی ابتدا کے متعلق کچھ نئے حقائق، ڈاکٹر جاوید وشسشٹ (پمفلٹ) ہریانہ چنڈی گڑھ، ۱۹۸۳ء
- ☆ اردو انشائیہ کی مزید بحث، ڈاکٹر انور سدید، اردو زبان سرگودہا، جنوری فروری ۱۹۸۳ء
- ☆ اردو انشائیہ کے خدوخال، مشکور حسین یاد، فنون لاہور، نومبر دسمبر ۱۹۷۶ء
- ☆ اردو انشائیہ کے خدوخال، سجاد نقوی، اوراق، جنوری فروری ۱۹۷۷ء
- ☆ اردو انشائیہ کے عناصر، شمیم ترمذی، پندرہ روزہ آہنگ کراچی، اپریل ۱۹۸۳ء
- ☆ اردو کا پہلا انشائیہ نگار، ڈاکٹر بشیر سیفی، ماہنامہ نیرنگ خیال راولپنڈی، اگست ۱۹۸۶ء
- ☆ اردو کے گم شدہ انشائیہ نگار، ڈاکٹر انور سدید، اردو زبان سرگودہا، انشائیہ نمبر، مارچ اپریل ۱۹۸۳ء
- ☆ انشائیہ، اطہر پرویز، ہم قلم کراچی، جنوری ۱۹۶۳ء
- ☆ انشائیہ، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، نیا دور کراچی، شمارہ نمبر ۳۵–۳۶

- ☆ انشائیہ، رام لعل نابھوی، مضمون (پمفلٹ کی صورت میں شائع ہوا)، اکادمی ہریانہ، ۱۹۷۹ء
- ☆ انشائیہ، جمیل آذر، نیرنگ خیال راولپنڈی گولڈن جوبلی نمبر، ۱۹۷۸ء
- ☆ انشائیہ، جمیل آذر، تخلیقی ادب کراچی، شمارہ نمبر ۲
- ☆ انشائیہ، احمد سہیل، اوراق لاہور، نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء
- ☆ انشائیہ، سلیم آغا قزلباش، چٹان لاہور، ۱۹ جولائی ۱۹۸۲ء
- ☆ انشائیہ، رضی عابدی، ماہنامہ ادب لطیف لاہور، دسمبر ۱۹۸۴ء
- ☆ انشائیہ اردو کی سب سے متنازعہ صنف ادب، ذوالفقار احمد تابش، امروز لاہور، ۸ جون ۱۹۸۴ء
- ☆ انشائیہ: اس اصطلاح کا موجد کون ہے، انور سدید، امروز لاہور، ۸ جون ۱۹۸۱ء
- ☆ انشائیہ انفرادی سوچ کا محرک، جمیل آذر، اوراق، انشائیہ نمبر، ۱۹۸۵ء
- ☆ انشائیہ اور انشائے لطیف، ڈاکٹر بشیر سیفی، ادب لطیف لاہور، گولڈن جوبلی نمبر، ۱۹۸۶ء
- ☆ انشائیہ اور طنز و مزاح، ڈاکٹر بشیر سیفی، ماہ نو لاہور، جولائی ۱۹۸۶ء
- ☆ انشائیہ اور نثری نظم، مشکور حسین یاد، فنون لاہور، اگست ستمبر ۱۹۸۲ء
- ☆ انشائیہ ایک تہذیبی صنف ادب، رشید نثار، کتابی سلسلہ مطلع خانیوال، شمارہ نمبر ۲، ۱۹۸۶ء
- ☆ انشائیہ ایک عظیم صنف ادب، وزیر آغا، اردو زبان سرگودہا، ستمبر اکتوبر ۱۹۷۷ء
- ☆ انشائیہ ایک لطیف صنف ادب، جمیل آذر، اوراق لاہور، شمارہ نمبر ۲، ۱۹۶۹ء
- ☆ انشائیہ پر ایک نوٹ، مرزا حامد بیگ، اردو زبان سرگودہا، انشائیہ نمبر، مارچ اپریل ۱۹۸۳
- ☆ انشائیہ ایک ہمہ جہت صنف نثر، سلیم آغا قزلباش، اوراق، انشائیہ نمبر، ۱۹۸۵ء
- ☆ انشائیہ تنقید کی زد میں، رشید نثار، اردو زبان سرگودہا، جنوری فروری ۱۹۷۸ء
- ☆ انشائیہ پر ایک نظر، پروفیسر یوسف بلخی، ہماری زبان علی گڑھ، یکم مئی ۱۹۶۲ء
- ☆ انشائیہ چوتھے کھونٹ کی دریافت، طارق جامی، اردو زبان سرگودہا، جنوری فروری ۱۹۷۸ء
- ☆ انشائیہ زندگی سے مربوط ہے۔ جمیل آذر، اوراق لاہور، جون ۱۹۸۳ء
- ☆ انشائیہ کا اسلوب، ڈاکٹر سلیم اختر، فنون لاہور، نومبر ۱۹۸۵ء
- ☆ انشائیہ کا زوال، ڈاکٹر سلیم اختر، ادب لطیف لاہور، گولڈن جوبلی نمبر، ۱۹۸۶ء
- ☆ انشائیہ کا فکری بیک یارڈ، اقبال آفاقی، اوراق لاہور، جولائی اگست ۱۹۷۸ء
- ☆ انشائیہ کچھ خیالات، سید احتشام حسن، ادیب علی گڑھ، انشائیہ نمبر، ۱۹۵۹ء
- ☆ انشائیہ کی اصطلاح، احمد جمال پاشا، اردو زبان سرگودہا، انشائیہ نمبر، مارچ اپریل ۱۹۸۳ء/ کتاب نما دہلی، اکتوبر نومبر ۱۹۸۳ء
- ☆ انشائیہ کی پہچان، وزیر آغا، اردو زبان سرگودہا، شمارہ نمبر ۱۱— ۱۲، ۱۹۶۹ء
- ☆ انشائیہ کی تکنیک، مسعود انور، اردو زبان سرگودہا، انشائیہ نمبر، مارچ اپریل ۱۹۸۳ء
- ☆ انشائیہ کی تعریف، ڈاکٹر بشیر سیفی، جنگ راولپنڈی، یکم دسمبر ۱۹۸۶ء
- ☆ انشائیہ کی کونپل، مرزا حامد بیگ، اوراق لاہور، جنوری فروری ۱۹۷۸ء
- ☆ انشائیہ کے ابتدائی روپ، ڈاکٹر سیدہ جعفر، ادیب علی گڑھ، انشائیہ نمبر، ۱۹۵۹ء
- ☆ انشائیہ کے چند پہلو، رشید نثار، اوراق، انشائیہ نمبر، ۱۹۸۵ء
- ☆ انشائیہ چند مسائل، سلیم آغا قزلباش، اردو زبان سرگودہا، انشائیہ نمبر، مارچ اپریل ۱۹۸۳ء
- ☆ انشائیہ کے لیے ڈاکٹر جانسن کی تعریف، ڈاکٹر انور سدید، کتابی سلسلہ مطلع

خانیوال، شمارہ نمبر ۳
☆ انشائیہ کیا ہے۔ پیٹر ویسٹ لینڈ ترجمہ، مسعود ہاشمی، ماہ نور لاہور، جون ۱۹۸۰ء
مفاہیم گیا، ادب نمبر، ۱۹۸۵ء
☆ انشائیہ کیا ہے، نظیر صدیقی، نگار پاکستان، اصناف ادب نمبر، ۱۹۶۶ء
☆ انشائیہ کیا ہے، غلام جیلانی اصغر، اوراق لاہور، مارچ اپریل ۱۹۷۲ء
☆ انشائیہ کیا ہے، ذوالفقار احمد تابش، اوراق لاہور، انشائیہ نمبر، ۱۹۸۵ء
☆ انشائیہ کیا ہے، ڈاکٹر بشیر سیفی، اوراق لاہور، اکتوبر نومبر ۱۹۸۶ء
☆ انشائیہ کیا ہے، ڈاکٹر وزیر آغا، ہماری زبان دہلی ر ۱۵، نومبر ۱۹۸۰ء / اوراق، ستمبر اکتوبر ۱۹۸۰ء
☆ انشائیہ کیا ہے، ڈاکٹر سید مقصود زاہدی، اہل قلم ملتان، شمارہ نمبر ۲
☆ انشائیہ کیا نہیں ہے، ڈاکٹر سلیم اختر، ماہنامہ شاعر بمبئی، شمارہ نمبر ۷، ۱۹۸۶ء
☆ انشائیہ کیوں، سلیم اختر، اوراق، مارچ اپریل ۱۹۷۲ء
☆ انشائیہ میں حوالہ جات، خالد اقبال، امروز لاہور، ادبی ایڈیشن، اپریل ۱۹۸۳ء
☆ انشائیہ میں خیال کی رو، انور سدید، قرطاس گوجوانوالہ
☆ انشائیہ مقبولیت کی راہ پر، سعد اللہ کلیم، اوراق لاہور، مارچ اپریل ۱۹۷۲ء
☆ انشائیہ نفسیات کے آئینے میں، ڈاکٹر سلیم اختر، فنون لاہور، جون جولائی ۱۹۸۶ء
☆ انشائیہ نگار کی شخصیت، ڈاکٹر سلیم اختر، نیرنگ خیال راولپنڈی سالنامہ، ۱۹۸۴ء
☆ انشائیہ نگاری، سلیم اختر، ماہ نو کراچی، مارچ ۱۹۶۶ء
☆ انشائیہ نگاری، مشتاق قمر، اوراق لاہور، اپریل مئی ۱۹۷۵ء
☆ انشائیہ نگاری، ڈاکٹر انور سدید، سب رس کراچی، اکتوبر ۱۹۸۵ء
☆ انشائیہ نما، ڈاکٹر قمر رئیس، ادیب علی گڑھ، انشائیہ نمبر، ۱۹۵۹ء
☆ انشائیہ کا سراپا، رحیم طلب، کتابی سلسلہ تحریر جڑانوالہ، شمارہ ۵
☆ انشائیے کا فن، حامد برگی، اوراق، انشائیہ نمبر، ۱۹۸۵ء
☆ انگریزی انشائیہ پر ایک نظر، اندرجیت لعل، ادیب علی گڑھ، انشائیہ نمبر، ۱۹۵۹
☆ ایسّے اردو ادب میں، حسن نور، ادب لطیف لاہور، ستمبر ۱۹۵۸ء
☆ ایسّے مغرب میں، ڈاکٹر سلیم اختر، نقوش لاہور، جون ۱۹۸۵ء
☆ بہادلپور میں انشائیہ کی شام کا خطبۂ صدارت، ڈاکٹر انور سدید، اردو زبان سرگودہا، اپریل ۱۹۸۲ء
☆ ذکر پھر انشائیہ کا، پرویز بزمی، روزنامہ امروز، لاہور، ۱۱ فروری ۱۹۸۳ء
☆ صنف انشائیہ کا مسئلہ، مشکور حسین یاد، نیرنگ خیال راولپنڈی، اپریل ۱۹۸۳ء
☆ کچھ اردو انشائیہ کے بارے میں، ڈاکٹر وزیر آغا، اردو زبان سرگودہا، مئی جون ۱۹۶۸ء (سالنامہ)
☆ کچھ انشائیہ کے بارے میں، پروین طارق، نوائے وقت راولپنڈی، ۸ جون ۱۹۸۷ء
☆ کچھ باتیں انشائیہ کے بارے میں، ذوالفقار احمد تابش، امروز لاہور، ۱۱ مئی ۱۹۸۴ء (ادبی ایڈیشن)
☆ کچھ انشائیہ کے بارے میں، جمیل آذر، نوائے وقت راولپنڈی، ۱۶ جولائی ۱۹۷۷ء
☆ کچھ انشائیے کے بارے میں، شہزاد منظر، اوراق، انشائیہ نمبر، ۱۹۸۵ء
☆ کیا انشائیہ ایک سنجیدہ صنف ادب ہے، مشکور حسین یاد، فنون لاہور، سالنامہ ۱۹۸۱ء
☆ ممکنات انشائیہ یا کاروبار فکاہیہ، خامہ بلوش، روزنامہ جسارت کراچی، ۲۲ جولائی ۱۹۸۳ء
☆ مونتین انشائیہ اور انشائیہ نگار، محمد ارشاد، فنون لاہور، جولائی ۱۹۸۲ء
☆ میرے پسندیدہ انشائیے، ہرچرن چاؤلہ، اوراق، انشائیہ نمبر، ۱۹۸۵ء

☆ وہی انشائیہ کی بات، صلاح الدین حیدر، چٹان لاہور، ۷ دسمبر ۱۹۸۱ء

انشائیہ نگاروں کے فن اور انشائیہ کی کتابوں پر تنقیدی مضامین:

☆ انشائیہ اور وزیر آغا، یوسف ظفر، اردو زبان سرگودہا، اپریل ۱۹۷۲ء

☆ انشائیوں کا ایک مجموعہ (خیال پارے)، قیوم ظفر، سالنامہ اردو زبان سرگودہا، مئی جون ۱۹۶۸ء

☆ انور سدید کی انشائیہ نگاری، مناظر عاشق ہرگانوی، اوراق لاہور، ستمبر ۱۹۸۱ء/ توازن بمبئی، شمارہ نمبر ۷، ۱۹۸۶ء

☆ انور سدید کے انشائیے، جمیل آذر، اوراق لاہور، ستمبر ۱۹۸۱ء

☆ انور سدید کے انشائیے، اکبر حمیدی، اوراق لاہور، اکتوبر نومبر ۱۹۸۵ء

☆ جمیل آذر کے انشائیے، انور سدید، نیرنگ خیال راولپنڈی، مارچ ۱۹۸۲ء

☆ شاخِ زیتون: سجاد نقوی، رام لعل نابھوی، اوراق لاہور، نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء

☆ جمیل آذر کے انشائیے، فتح محمد ملک، نوائے وقت راولپنڈی، ۲۱ جولائی ۱۹۸۶ء

☆ جمیل آذر کے انشائیے، ڈاکٹر بشیر سیفی، نوائے وقت، راولپنڈی، یکم دسمبر ۱۹۸۶ء

☆ سرشار بحیثیت انشائیہ نگار، ڈاکٹر احراز نقوی، نقوش لاہور، جنوری ۱۹۶۶ء

☆ غلام جیلانی اصغر کے انشائیے، ڈاکٹر انور سدید، اوراق لاہور، مئی جون ۱۹۸۳ء

☆ کرشن چندر کے انشائیے، ڈاکٹر سید محمد حسنین، شاعر بمبئی، کرشن نمبر، ۱۹۶۷ء

☆ محمد یونس بٹ کی انشائیہ نگاری، تحسین فراقی، سیارہ لاہور، اپریل ۱۹۸۶ء

☆ مشتاق احمد یوسفی: ایک انشائیہ نگار، نظیر صدیقی، سیپ کراچی، شمارہ نمبر ۱۲

☆ ڈاکٹر وزیر آغا اور انشائیہ، رشید نثار، نگار پاکستان کراچی، ستمبر ۱۹۸۵ء

☆ وزیر آغا کی انشائیہ نگاری، جمیل آذر، تخلیقی ادب نمبر ۳، کراچی

☆ وزیر آغا کے انشائیے، میرزا ادیب، ادب لطیف لاہور، ستمبر ۱۹۶۱ء

☆ وزیر آغا کے انشائیے، احمد سعید ہمدانی، اردو زبان سرگودہا، نومبر دسمبر ۱۹۷۳ء

☆ وزیر آغا کے انشائیے، ڈاکٹر بشیر سیفی، سیارہ لاہور، ستمبر اکتوبر ۱۹۸۶ء

☆ آم کے آم (رام لعل نابھوی)، ڈاکٹر انور سدید، اوراق لاہور، انشائیہ نمبر ۱۹۸۵ء

☆ انشائیہ اردو ادب میں (ڈاکٹر انور سدید)، ڈاکٹر سہیل بخاری — رشید امجد، اوراق، انشائیہ نمبر، ۱۹۸۵ء

☆ انشائیہ اردو ادب میں (ڈاکٹر انور سدید)، جمیل آذر، امروز لاہور (ادبی ایڈیشن)، ۷ جون ۱۹۸۵ء

☆ انشائیہ اردو ادب میں (ڈاکٹر انور سدید)، ڈاکٹر انور محمود خالد، روزنامہ امروز لاہور (ادبی ایڈیشن)، ۲۷ نومبر ۱۹۸۴ء

☆ انشائیہ اردو ادب میں (ڈاکٹر انور سدید)، صابر لودھی، نیرنگ خیال راولپنڈی، اگست ۱۹۸۵ء

☆ انشائیہ اردو ادب میں (ڈاکٹر انور سدید)، جمیل آذر، نوائے وقت راولپنڈی، ۳ جون ۱۹۸۵ء

☆ انشائیہ اردو ادب میں (ڈاکٹر انور سدید)، اکبر حمیدی، حیدر راولپنڈی، ۸ مارچ ۱۹۸۵ء

☆ انشائیہ اردو ادب میں (ڈاکٹر انور سدید)، خیر الدین انصاری، اردو زبان سرگودہا، جنوری فروری ۱۹۸۷ء

☆ انشائیوں کی پانچ کتابیں، محمد اسد اللہ، اردو زبان سرگودہا، انشائیہ نمبر ۱۹۸۳ء

☆ پھوار (شمیم ترمذی)، ڈاکٹر وزیر آغا، اوراق لاہور، اپریل مئی ۱۹۸۷ء

☆ جریزے کا سفر (اکبر حمیدی)، ڈاکٹر بشیر سیفی، اردو ادب راولپنڈی، تبصرہ نمبر، نومبر ۱۹۸۵ء
☆ جریزے کا سفر (اکبر حمیدی)، صابر لودھی، ماہ نو لاہور، اکتوبر ۱۹۸۶ء
☆ جریزے کا سفر (اکبر حمیدی)، نظیر صدیقی، کتاب لاہور، مارچ ۱۹۸۶ء
☆ جریزے کا سفر (اکبر حمیدی)، حامد برگی، اوراق لاہور، اپریل ۱۹۸۶ء
☆ جریزے کا سفر (اکبر حمیدی)، محمد منشا یاد، نیرنگ خیال راولپنڈی، سالنامہ ۱۹۸۶ء
☆ جریزے کا سفر (اکبر حمیدی)، فرحت نواز، نوائے وقت ملتان، ۱۶ فروری ۱۹۸۶ء
☆ جریزے کا سفر (اکبر حمیدی)، حسن طاہر، پاکستان ٹائمز لاہور، ۲۱ اپریل ۱۹۸۶ء
☆ جریزے کا سفر (اکبر حمیدی)، سلیم آغا قزلباش، نوائے وقت راولپنڈی، ۲۶ جون ۱۹۸۶ء
☆ جریزے کا سفر (اکبر حمیدی)، حامد برگی، مسلم اسلام آباد، ۶ جون ۱۹۸۶ء
☆ جزیزے کے سفر کی دعوت، جمیل آذر، جنگ راولپنڈی، ۱۳ جنوری ۱۹۸۶ء
☆ چاہ خنداں (محمد یونس بٹ)، صابر لودھی، سیارہ لاہور، اپریل مئی ۱۹۸۶ء
☆ چاہ خنداں کی شگفتہ تحریریں (محمد یونس بٹ)، اسرار زیدی، اخبار جہاں کراچی، ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۵ء
☆ انشائیوں کی نئی کتاب (دوسرا کنارہ — وزیر آغا)، رشید امجد، اردو زبان سرگودہا، انشائیہ نمبر، مارچ اپریل ۱۹۸۳ء
☆ ذکر اس پری وش کا (ڈاکٹر انور سدید)، فرحت نواز — سجاد نقوی، اوراق لاہور، نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء
☆ ذکر اس پری وش کا (ڈاکٹر انور سدید)، ڈاکٹر خورشید رضوی، اردو زبان سرگودہا، نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء
☆ ذکر اس پری وش کا (ڈاکٹر انور سدید)، فرحت نواز — رام لعل نابھوی، جدید ادب خان پور، مارچ ۱۹۸۳ء
☆ ذکر اس پری وش کا (ڈاکٹر انور سدید)، جوگندر پال، اوراق، انشائیہ نمبر، ۱۹۸۵ء
☆ ذکر اس پری وش کا (ڈاکٹر انور سدید)، کرنل غلام سرور، اوراق لاہور، اپریل مئی ۱۹۸۲ء
☆ ذکر اس پری وش کا (ڈاکٹر انور سدید)، عذرا اصغر، تخلیق لاہور، جنوری ۱۹۸۲ء
☆ سرگوشیاں (سلیم آغا قزلباش)، جمیل آذر، کتابی سلسلہ خیابان راولپنڈی، شمارہ ۲:
☆ سرگوشیاں (سلیم آغا قزلباش)، رام لعل نابھوی — اکبر حمیدی، اوراق لاہور، فروری مارچ ۱۹۸۱ء
☆ سرگوشیاں پر ایک نظر (سلیم آغا قزلباش)، محمد منشا یاد، جدید ادب خان پور، ستمبر ۱۹۸۱ء
☆ سفید بال (سلمان بٹ)، اسرار زیدی، اخبار جہاں کراچی، ۱۵ تا ۲۱ جون ۱۹۸۷ء
☆ شاخ زیتون (جمیل آذر)، انور قدوس سیمی، جنگ راولپنڈی، ۱۹ اپریل ۱۹۸۲ء
☆ شاخ زیتون پر ایک نظر (جمیل آذر)، ڈاکٹر وزیر آغا، نیرنگ خیال راولپنڈی، اگست ۱۹۸۴ء
☆ منتخب انشائیے (سلیم آغا قزلباش)، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ — ممتاز محمد خان،